UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224240
UNIVERSAL
LIBRARY

رجسٹرڈ نمبر) اے ۴۷۸

بنام خداوند جان آفریں

جامعیت جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

تاریخ اجراء الناظر سنہ ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر: ظفر الملک علوی

نمبر ۴	اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء	جلد ۴۰

فہرست

ریاست بنی اسرائیل - جناب منشی امیر احمد علوی صاحب بی اے پنشنر ڈپٹی کلکٹر ۱۹۳
غزل - جناب شیخ ارشاد حسین صاحب واثق وکیل ہائی کورٹ حیدرآباد دکن ۲۰۵
کلام ریاض - جناب مسٹر محمد محسن صاحب ایم اے ۲۰۶
بنام ترک - جناب مولوی محمد خلیل الرحمن صاحب مترجم اخبار الاندلس ۲۱۷
فلسفۂ عشق - جناب تسنیم مینائی بی اے ایل ایل بی ۲۳۲
محبت - مسٹر مظفر علی صاحب قدوائی ۲۳۳
بال جبریل کی ایک طرح پر - جناب پروفیسر جلیل احمد صاحب جلیل قدوائی ایم اے ۲۴۰
فراق - جناب سید مطلب حسین صاحب عالی لکھنوی بی اے ۲۴۱
نوائے ثاقب - جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی ۲۴۹
ترکیب بند بر وفات عزیز - جناب ابو الکمال آمید امیٹھوی ۲۵۰
قطعہ تاریخ ارتحال حضرت عزیز - جناب مولانا عالم صاحب لکھنوی و جناب کوہی سید ہادی صاحب ہادی ۲۵۱
قطعہ تاریخ وفات حضرت عزیز - جناب پروفیسر آغا اشہر صاحب ایم اے لکھنوی ۲۵۲
خون کے آنسو - جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی ۲۵۲
مٹتے جاتے ہیں جہاں سے گلستان شاعری جناب مولوی حافظ علی صاحب بیکس بلگرامی ۲۵۳
نظرے خوش گزرے ۲۵۴
دو میرزا (صرف قسم عام میں) جناب مولوی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم بی اے ایل ایل بی ۲۵ / ۳۲

قسم عام (رنگین سرورق، چکنا کاغذ)	۸ؔ/	سالانہ مع محصول ڈاک	فی پرچہ ۵/
ارزاں ایڈیشن (سادی سرورق، کھرا کاغذ)	عہ/	" "	" ۲/

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Checked 1976

اردو کی بہترین کتابیں

بہترین انشا پرداز
انعامی مقابلے کے مجموعہ مضامین آزاد، حالی، نذیر احمد و شبلی کی تصانیف پر تبصرہ اور ان کی انشا پردازی کے نمونے
قیمت

تاریخ عرب
عربوں کے فتوحات، ان کے تمدن، علمی کمالات، ایجادات و اختراعات کا قابل دید بیان
از موسیو سدیو فرانسیسی۔
قیمت

مرزا غالب مرحوم
- اردوی معلی
- عود ہندی ۸ر
- دیوان غالب
- مکمل دیوان غالب

سرسید مرحوم
- خطبات احمدیہ
- مکمل مجموعہ لکچر
- اسباب بغاوت ہند ۸ر
- مضامین تہذیب الاخلاق
- خطوط سرسید

نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- مکمل مجموعہ لکچر
- تقلید و عمل بالحدیث ۱۲ر
- کتاب المحبت والشوق ۱۲ر
- مکاتیب

مولانا حبیب الرحمن شروانی
- اسلامی اخلاق ۸ر
- سیرۃ الصدیق ۱۲ر
- علمائے امت

مولانا آزاد مرحوم
- آبحیات
- دربار اکبری
- نگارستان فارس
- نیرنگ خیال
- سیر ایران
- ڈراما اکبر
- مجموعہ نظم آزاد
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد

مولانا ابو الکلام آزاد
- ترجمان القرآن
- تذکرہ
- ذکرے ۸ر
- قول فیصل

مولانا محمد یونس مرحوم
- ابن رشد
- روح الاجتماع

مولانا عبد اللہ عمادی
- تاریخ عرب قدیم ۱۲ر
- کتاب المعارف

مولانا نذیر احمد مرحوم
- بنات النعش
- مرآۃ العروس ۸ر
- توبۃ النصوح ۹ر
- رویائے صادقہ
- ایامی
- فسانہ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر ۱۲ر
- مجموعہ نظم بے نظیر
- لکچروں کا مجموعہ ۲ جلد

مولانا شرر مرحوم
- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- نور جہاں بیگم ۸ر
- حیات صلاح الدین

مولوی ابو الحسن فرید آبادی
- ترجمہ تاریخ مصر
- ترجمہ رشحات
- ترجمہ عوارف المعارف
- علم السیاست
- منہاج السالکین

مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب مجلد
- حیات سعدی
- مقدمہ شعر و شاعری کلاں
- دیوان حالی کلاں
- مسدس حالی ۸ر
- مجموعہ نظم حالی
- بیوہ کی مناجات ۲ر
- شکوۂ ہند ۲ر

مولانا رشید احمد انصاری
- المدنیۃ والاسلام
- تحریر المرأۃ

مولوی عبد الباری آسی
- تذکرۃ الخواتین
- تذکرۂ خندۂ گل
- شرح دیوان غالب
- شرح کلام غالب

قاضی احمد میاں اختر
- اسلامی کتب خانے
- علم اور اسلام ۱۰ر
- سترجمات ۸ر

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول مجلد
- ،، جلد دوم ،،
- ،، جلد سوم ،،
- ،، جلد چہارم ،،
- الفاروق ۸ر
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سفرنامہ مصر و شام و روم
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم ۵ جلد
- مذہبی مقالات
- ادبی مقالات ۱۲ر
- تعلیمی مقالات
- تنقیدی مقالات
- موازنۂ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر ۸ر
- مجموعہ کلام شبلی اردو ۱۰ر
- مکاتیب شبلی ۲ جلد
- خطوط شبلی

مولانا سید احمد دہلوی
- فرہنگ آصفیہ جلد اول
- لغات النساء

مرزا حیرت دہلوی
- الف لیلہ دنیا زاد
- قصہ حاجی بابا اصفہانی
- ناول روز الیبرٹ
- سوانح عمری عمر خیام

مرزا سجاد مرزا بیگ دہلوی
- الانسان
- الاستدلال
- الفہرست
- حکمت عملی

صفدر مرزا پوری
- بزم خیال
- مرقع ادب ۲ جلد
- مشاطۂ سخن ۲ جلد

منشی محمد مہدی
- رموز فطرت
- الشان ۸ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بنام خداوند جاں آفریں

1952

الناظر

نمبر ۴ جلد ۴۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء

ریاست بنی اسرائیل

(جناب الحاج منشی امیر احمد علوی صاحب بی اے پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

بخت نصر کی غارت گری - بابل کی غلامی - شامیوں کی سفاکی کے بعد بنی اسرائیل کی ارض کنعان میں خود مختار حکومت - قوم کی جانبازی - سرفروشی - اور شوق شہادت کا حیرت انگیز کارنامہ ہے - ایک ہزار برس پہلے طالوت اور داؤد نے اس سرزمین پر سلطنت کا بنیادی پتھر رکھا تھا مگر اُس وقت اطراف و جوانب میں کوئی زبردست منظم قوت موجود نہ تھی - ایران میں طوائف الملوکی تھی - بابل و نینوا عالم طفلی کے خواب راحت میں تھے - یونان بے دست و پا تھا اور مصر میں زمانہ جنگی ہو رہی تھی - مگر جس وقت انٹیوکس بادشاہ شام کے مظالم سے ناچار آکر یہود انقابی نے علم آزادی بلند کیا ہر طرف طاقتور حکومتیں حرص و طمع کے دانت نکالے باغیوں کی سرکوبی کے لیے تیار تھیں -

شمال و مشرق میں سلطان شام سطوت و جبروت سے کوس لمن الملکی بجا رہا تھا - جنوب میں سکندر کے جانشین مصری ٹالمیون کا زور شور تھا - مغرب میں رومۃ الکبریٰ کی جمہوری حکومت روز افزوں ترقی کر رہی تھی اور یونان کو مغلوب کر چکی تھی - یہود کا ملجا و ماویٰ مقدس یروشلیم

دشمنوں کے تصرف میں تھا حتیٰ کہ عبادت گاہ سلیمانی میں بھی یونانی دیوتاؤں کی خدائی تھی۔ اس عاجزی۔ بے بسی اور نا امیدی کے ماحول میں حصول آزادی کی کوشش اور کامیاب انقلاب کی سعی مشکور یہود استقابی کے صدق و خلوص کی کرامت تھی اور صفحات تواریخ اسکی ہمت۔ شجاعت اور دانشمندانہ قیادت پر جس قدر آفرین کریں بجا و درست ہے۔ اُس نے خون جگر سے نخل آزادی سیراب کیا اور جان بیچ کر قوم کو ظالموں کے پنجے سے رہائی دلائی۔

اُسکا جانشین یوناتھن مدبری اور حکمت عملی میں برادر بزرگ سے زیادہ کامیاب ہوا۔ دشمنوں سے ہیکل مقدس کی تولیت کا خلعت اور ارض موعود کی حکومت کا تاج وصول کیا مگر یہ سعادت شمعون مقابی کی قسمت میں تھی کہ اُس نے اپنے اُولوالعزم بھائیوں کے

شمعون

نصب کردہ باغ کا پھل کھایا اور خود مختاری کا اعلان کر کے سلطنت یہودکا پہلا بادشاہ ہوا

اُس نے رومۃ الکبریٰ سے رشتۂ اتحاد مستحکم کیا۔ اسرائیلی سکہ علاقہ محروسہ میں جاری کیا۔ شریعت موسوی کی ترویج کی۔ زراعت و تجارت کو ترقی دی۔ رعایا کی رفاہ و فلاح کی تدابیر میں مصروف رہا۔ قوم پروری اور دادگستری کو اپنا شعار بنایا۔ شہروں کو قلعہ بند کیا۔ سامان خوراک میں افزایش کی۔ بادشاہ شام نے خراج کا مطالبہ کیا تو اپنے لڑکے جان کو فوج کا سپہ سالار بنا کر جنگ کے لیے روانہ کیا اور ۱۳۹ق م میں اشدود کے مقام پر شامیوں کو سخت شکست دی۔ اُس نے فلسطین میں امن قائم کیا اور اُس کی شہرت دنیا میں پھیلی۔ فرزندان یعقوب زیتون اور انجیر کے درختوں کے نیچے آرام کرتے اور کوئی اُنکو ستانے والا نہ تھا ہیکل مقدس کی آرایش و زیبایش میں اضافہ کیا اور بعض بیش بہا ظروف عبادت خانہ کی نذر کیے۔

اُسکے عالی منزلت بھائیوں کو بستر علالت پر موت نصیب نہ ہوئی۔ شجاع یہودا میدان جنگ میں شہید ہوا۔ مدبر یوناتھن فریب سے گرفتار کیا گیا اور قتل ہوا۔ اقبالمند شمعون اس منزل میں سابقین اولین کا ہمقدم نکلا۔ اگلوں کو دشمنوں نے ہلاک کیا اس کی جان خویش نے لی۔ اسکا داماد حکومت اور ریاست کی ہوس میں سسر کا خون بہانے پر مستعد ہوا۔ شمعون اور اُسکے لڑکوں کو دعوت کے بہانے اپنے گھر بلایا اور فریب سے قتل کر دیا۔ مگر اس بے گناہ خون سے داماد کو کچھ نفع نہ ہوا۔ سسر اور دو سالے مارے گئے لیکن تیسرا ضیافت میں حاضر نہ تھا اور وہی شمعون کا پسر اکبر تھا۔ جلاد اُس کی تلاش کو نکلے مگر وہ اُنکے دام سے بچ کر یروشلم پہنچا اور سلطنت کا کاروبار ہاتھ

جان ہرکنس

میں لیکر جان ہرکنس کے لقب سے یہود کا دوسرا خود مختار بادشاہ ہوا۔ اندرونی سازشوں کو مٹا کر اور ملک جنوبی یہودیہ کی جاگیر منضبط کرکے آبائی ریاست کے استحکام کی طرف متوجہ ہوا۔ پہلے بادشاہ شام سے خراج اور فوجی امداد کا سبز باغ دکھا کر اتحاد کیا اور اُن سے نصرت و حمایت کا معاہدہ کیا۔ اُس نے تیس برس شان و شوکت سے حکومت کی اور اُسکا عہد بنی اسرائیل کے لیے فارغ البالی اور مرفہ الحالی کا مسلسل جشن تھا۔ بستر مرگ پر سلطنت کا انتظام اپنی بیوی کے سپرد کیا اور خلف اکبر کو متولی اعظم کا منصب عنایت کرکے سنہ ۱۰۵ قبل مسیح میں دنیا سے رخصت ہوا۔

شاہزادے نے ماں کو قید کرکے فاقوں سے ہلاک کیا اور خود ارسطو بولس کے لقب سے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ بھائیوں کو اسیر کیا۔ اعزہ ناراض ہوئے اور رعایا بدظن۔ سال ہی بھر کے بعد حسرت و اندوہ سے مرگیا اور اُس کا بھائی سکندر مقابی قید خانہ سے نکل کر سلطنت یہود کا چوتھا بادشاہ ہوا۔

سکندر مقابی

سکندر بہادر اور جنگجو تھا۔ سلطنت کا رقبہ وسیع تھا اور اُسکے عہد میں مملکت کے وہ قدیم حدود بحال ہوئے جو حضرت داؤد کے زمانے میں تھے لیکن وہ کینہ پرور اور بدطینت بھی تھا۔ شراب اُس کی گھٹی میں پڑی تھی اور عورتوں کا مشتاق رہتا تھا۔ اکابر قوم اُس کے افعال ناپسندیدہ سے بیزار تھے

اُس زمانہ میں بیرونی حملوں اور دشمنوں کی لوٹ مار سے مطمئن ہوکر یہودی مذہبی مسائل کی موشگافی میں مصروف تھے۔ جس طرح آجکل ہندوستان کے مسلمان بدقسمتی سے فرعی مسئلوں کے اختلاف پر ایک دوسرے کی تکفیر کار ثواب سمجھتے ہیں ویسا ہی اُس امن و عافیت کے عہد میں بنی اسرائیل کا حال تھا۔

ایک گروہ علی الاعلان شریعت موسوی سے روگردان اور یونانیوں کی ہر ادا پر قربان تھا۔ دوسرا گروہ حفاظت مذہب کے نام سے اہل مذہب کا حقیقی دشمن تھا۔ ایک جماعت صدوقی کہلاتی تھی۔ مذہب کو عقل سے مطابق کرنے کی سعی میں تقدیر کی قائل نہ تھی۔ روح کی بقا۔ عذاب دائمی اور وجود ملائکہ سے انکار کرتی تھی۔ دوسری جماعت فریسی۔ شریعت کے الفاظ ظاہری کی پابند تھی اور کسی تاویل کو جائز نہ سمجھتی تھی۔ تیسرا طبقہ اسینی ترک لذات دنیوی کو نجات کے لیے لازم سمجھ کر شراب اور گوشت سے محترز تھا۔ شب و روز ریاضت و عبادت میں منہمک رہنا شرط ایمان

تصور کرتا تھا۔
سامری ان سب سے الگ مذہبی روایات میں قسم قسم کے افسانے شامل کرتے تھے۔ سب فرقے ایک دوسرے کو گمراہ اور مرتد خیال کرتے تھے۔ ہر جماعت کی تمنا تھی کہ کنعان میں صرف اُسی کا وجود رہے اور بقیہ گروہ فنا ہو جائیں۔ مباحثے اور مناظرے جدال و قتال کے میدان بنتے تھے۔ آزاد خیالی اور اختلاف نظریات کی بدولت عابدوں اور زاہدوں سے مذہب کے نام پر درندوں کے سے افعال سرزد ہوتے تھے۔ سکندر صدوقیوں کا طرفدار تھا۔ اسکے خلاف سازشوں کا جال پھیلا۔ راز قبل از وقت فاش ہو گیا اور بادشاہ نے ہزاروں یہودی صلیب پر آویزاں کر دیے۔ فریسی قتل ہوتا تو صدوقی خوشیاں مناتے۔ ایسی مارا جاتا تو سامری تالیاں بجاتے۔ قوم تباہ ہو رہی تھی اور ہم قوم خوش تھے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔
۲۵ سال حکومت کرکے ۷۹ء میں سکندر دنیا سے رخصت ہوا اور اُسکی بیوہ ملکہ الیکزنڈرا سلطنت یہود کی فرماں روا ہوئی۔ ہیکل مقدس کی تولیت عورت نہ کر سکتی تھی لہذا یہ منصب اُسکے بیٹے ہرکینس کے سپرد ہوا اور انتظام جہاں داری دانشمند ملکہ نے کیا۔ اُس نے شوہر کی وصیت کے مطابق فریسیوں کی امداد کی اور اُسکے عہد میں امن رہا۔ فوج اور خزانہ کی نگرانی ہوئی۔ سلطنت کے دبدبہ میں فرق نہیں آیا۔ مگر اُس کی آنکھ بند ہوتے ہی سکندر کے بیٹوں نے خانہ جنگی شروع کی۔ ارسٹوبولس دوم کامیاب ہو کر یہود کا چھوٹا بادشاہ ہوا۔ اور متولی اعظم ہرکینس یروشلم سے فرار ہو گیا۔
ایدوم کے گورنر انٹی پیٹر نے ہرکینس کی اعانت کی اور بعض عربی قبائل کی مدد سے فوج اکٹھا کرکے شاہ یہود سے جدال و قتال شروع کیا۔ جنگ کا انجام ظاہر نہ ہو پایا تھا کہ رومیوں نے مداخلت کی اور فریقین کو اپنا فیصلہ منظور کرنے پر مجبور کیا۔

پامپی رومۃ الکبریٰ کی جمہوری سلطنت کا نامور سپہ سالار پامپی جس نے ۳۵ سال کی امارت میں ۲۱ بادشاہوں کو زیر کیا۔ ۸۰۰ جہاز۔ ایک ہزار قلعے۔ نوسو شہر فتح کیے اور ۲۹ جدید شہر آباد کیے۔ آرمینیا اور شام کی حکومتیں تباہ کرکے ۶۳ء قبل مسیح میں جنوب کی طرف پیشقدمی کر رہا تھا کہ اُسکو شہزادگان یروشلم کے نزاع اور جدال کی خبر ملی۔ وہ اُن کے جھگڑے کا تصفیہ کرنے آیا۔ ہرکینس کے حقوق مرجح قرار دیے مگر یہودیوں کی ایک جماعت نے اُسکی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کیا اور رومی سپہ سالار کو یروشلم کا محاصرہ کرنے کے لیے بہانہ ملا۔
اسرائیلیوں نے ہمت و استقلال سے تین مہینے تک شہر کی حفاظت کی۔ سامانِ خوراک

ختم ہوا۔ فاقہ کشی کی نوبت پہونچی۔ ضبط وتحمل کی قوت گھٹی۔ فصیل میں رخنے پڑ گئے اور شہر بزور شمشیر فتح ہوا۔ ۱۲ ہزار یہودی قتل ہوے۔ یروشلیم کی شہر پناہ مسمار کی گئی۔ پامپی ہیکل سلیمانی میں داخل ہوا بلکہ اُس مقدس ترین حصہ میں بھی قدم رکھا جو ہمیشہ غلاف پوش رکھا جاتا تھا۔ جسکے پردے سال میں صرف ایک بار اُٹھائے جاتے تھے اور عوام کو اُسکے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جنگ کا انجام یہ ہوا کہ سامرہ خود مختار۔ گلیلی وغیرہ بعض شہر ریاست کنعان سے خارج کرکے صوبۂ شام میں شامل کیے گئے۔ ہرکینس متولی اعظم بنایا گیا اور سالانہ خراج مقرر ہوا۔ ارسٹی بولس کو فاتح گرفتار کرکے اپنے لشکر کے ہمراہ لے آیا۔

اس طرح ایک صدی کے بعد۔ یہود کی خود مختار سلطنت کا خاتمہ ہوا مگر حکومت کا نام ہنوز باقی تھا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے۔

سکندر یونانی کے انتقال کے بعد اسکا مفتوحہ علاقہ فوجی سرداروں میں تقسیم ہوا تو مملکت مصر ٹالمی کے حصہ میں آئی تھی۔ تقریباً تین سو برس تک اُسکے جانشین وادی نیل پر حکومت کرتے رہے۔ ۵۱ قبل مسیح میں ٹالمی اولیٹس فوت ہوا تو اُس کی اولاد نابالغ تھی۔ بستر مرگ پر وصیت کی کہ اس کا بڑا لڑکا ٹالمی اور لڑکی کلوپٹرا اشتراک فرماں روائے مصر ہوں اور دوران نابالغی میں روما کی جمہوری سلطنت ان کمسنوں کی سرپرستی اور حفاظت کرے۔ رومیوں نے خندہ پیشانی سے یہ ذمہ داری منظور کی۔ اور اپنے سپہ سالار پامپی کو ان نوعمر وارثوں کا ولی مقرر کردیا۔ یروشلیم کی آزادی سلب کرنے کے بعد وہ مصر کی طرف جاتا مگر شدید ضرورتوں سے اُسکو دارالسلطنت کی طرف واپس جانا پڑا۔ وہاں فرقہ بندی کی نزاعات میں پھنسا۔ روما کے شہرۂ آفاق جنرل جولیس

جولیس سیزر

کا آفتاب اقبال چمکا۔ پامپی کا ستارہ گردش میں آیا۔ لڑائی میں شکست ہوئی۔ اور وہ عزت بچانے کے لیے مصر کی طرف فرار ہوا۔ نابالغ ٹالمی اُسوقت صرف تیرہ برس کا تھا۔ رفیقوں نے صلاح دی کہ وہ پامپی کو قتل کراکے روما کے نئے سردار سیزر سے رشتۂ اتحاد مستحکم کرے تاکہ آیندہ فسادات میں شریک سلطنت بہن سے مقابلہ کے وقت رومیوں کی حمایت سے فائدہ پہونچے۔ پامپی کی کشتی ساحل مصر پر پہونچی۔ ٹالمی فوج ولشکر لیے اپنے ولی کے استقبال کو حاضر تھا مگر جیسے ہی بدنصیب سردار نے خشکی پر قدم رکھا ایک مصری نے پشت سے خنجر کا وار کیا۔ دو پہلوانوں نے ہاتھ پکڑ لیے۔ مقابلہ فضول تھا۔ ٹالمی نے چادر سے اپنا چہرہ

چھپا لیا۔ زمین پر گرا اور تڑپ تڑپ کر جان دی۔ جولیس سیزر فتحمندی کے نشہ سے جھومتا پاپمی کے تعاقب میں آرہا تھا مگر اُس کی آمد سے پہلے ہی پاپمی قتل ہوچکا تھا۔ وہ ۱۰۰ سوار اور ۳۲۰۰ پیادوں کی مختصر جمعیت سے اسکندریہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا اور مصری حکومت نابالغ بادشاہ کے ولی اور سرپرست کی حیثیت سے اپنے ہاتھ میں لینا چاہی۔

اُس نے دیکھا کہ ملک میں بدامنی ہے۔ ٹالمی اور کلوپٹرا میں عداوت پڑگئی ہے۔ بہن منافع سلطنت سے محروم ہے اور بھائی کُل علاقے پر قابض ہے۔ اُس نے فریقین کو اپنی فوجیں منتشر کرنے کا حکم دیا اور دونوں نابالغوں کو نزاعات کے تصفیہ کے لیے اپنے حضور میں طلب کیا۔ مصر خودمختار تھا۔ یہ خودسرانہ احکام حقوق شاہی میں مداخلت تصور کیے گئے۔ قوم پرست ناراض ہوئے اور جنگ پر تیار رہوگئے۔ سیزر نے سمجھایا کہ وہ بادشاہ متوفی کی وصیت کے مطابق نابالغوں کا ولی ہے اور اُس کو اُنکی باہمی رنجشوں کے تصفیہ کا حق ہے۔ رعایا خاموش ہوئی۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی فریقین کے وکلا بحث کرنے لگے۔ کلوپٹرا نہایت چالاک۔ زیرک و دانا تھی۔ سوچی کہ اُس کا حسن گلوسوز مقدمہ کے فیصلے میں بہت موثر ہوگا۔ انوکھی ترکیب سے سیزر کی خلوت میں پہونچی۔ ملازم خاص ملکہ کی ہدایت کے مطابق اُس کو کپڑوں سے ڈھانک، گٹھری بنا۔ رسیوں سے کس۔ لکڑی کے سہارے کاندھے پر رکھ کر سیزر کے دروازے پر لایا۔ پھاٹک کے محافظوں کی معرفت اطلاع کرائی کہ وہ رومی سردار کے لیے تحایف لایا ہے۔ داخلہ کی اجازت ہوئی۔ خلوتِ خاص میں رسائی پاکر نذر اطاعت کی پونجی سردار کے قدموں پر نثار کی۔ سپہ سالار نے حیرت و استعجاب سے گٹھری کی گرہ کھولی تو خوبصورت کلوپٹرا اُس میں سے نکلکر سامنے کھڑی ہوئی اور سر تسلیم خم کیا۔

داور حشر ہوگیا اُن کا تھے وہ انداز سر جھکانے کے

رنگین مزاج جنرل حسن و جمال کی مجسم تصویر دیکھ کر دنگ ہوگیا۔ جن آنکھوں میں خوبصورت عورتیں بسی ہوں اُنکے لیے دُنیا تاریک ہے۔ ملکہ کی سب آرزوئیں پوری ہوئیں اور سیزر نے فیصلہ کیا کہ بھائی بہن مشترکاً حکومت کریں۔

مصر کا وزیر اعظم کلوپٹرا کے خلاف تھا۔ اُس نے سیزر کے خلاف ملک میں پروپگنڈا کیا۔ ملکہ کی بداخلاقی مشہور کی۔ اور رعایا کو بھڑکایا کہ سیزر چند روز میں ٹالمی کو امور مملکت سے بیدخل کرکے کلوپٹرا کو فرماں روا سے مطلق بنانے والا ہے۔ بغاوت کی آگ بھڑکی۔ مصری سپہ سالار ۲۰ ہزار فوج لیکر سیزر کو اسکندریہ سے نکالنے آیا۔ رومی سپہ سالار نے اپنی مختصر جماعت کو شہر کی گلیوں اور کوچوں

میں پھیلا کر دانشمندی سے عزت بچائی - مصریوں نے اسکے بیڑے میں آگ لگانا چاہی - سیزر نے تیز دستی سے اُنکے جہازات جلا دیے - شعلہ فشاں جہاز بہتے ہوے گھاٹ کے قریب آ گئے - شہر کے مکانات میں آگ لگی اور اسکندریہ کا مشہور عالم کتب خانہ جس میں چار لاکھ بے نظیر اور نایاب کتابیں جمع تھیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا -

(یہی وہ کتب خانہ تھا جسکے برباد کرنے کا الزام آٹھ سو برس کے بعد عرب کے جاہلوں پر لگایا گیا اور غلط منطقی استدلال کی مثال یوروپ میں ضرب المثل کی طرح استعمال ہونے لگی کہ "وہ کتابیں اگر قرآن کے مطابق ہیں، تو اُن کا رکھنا فضول ہے اور اگر قرآن کے خلاف ہیں تو اُنکو جلا دینا چاہیے - بہر حال وہ جلا دی جائیں")

ملک کی حالت روز بروز بدتر ہونے لگی - جنگ کو طول ہوا - سیزر نے دوسرے ممالک سے مدد منگائی - ایشیاء کوچک سے جہازات کا بیڑا آیا - شام اور سواحل کے علاقوں نے فوج بھیجی - ایدوم کا انٹی پیٹر جو ہرکینس شاہ یہود کا دست راست تھا - تین ہزار یہودی لیکر سیزر کی مدد کو آیا - مصر کے راستے یہودیوں کے قبضے میں تھے - اُنھوں نے امدادی فوجیں اپنے ملک سے بے مزاحمت گزرنے دیں اور انکو رسد پہونچائی - اس تازہ دم فوج کی آمد سے لڑائی کا پانسہ پلٹا - دریاء نیل کے قریب باغیوں سے فیصلہ کُن جنگ ہوئی - سیزر کو کامل فتح نصیب ہوئی - ٹالمی بھاگا اور دریا میں غرق ہو گیا - اسکندریہ اور کُل مملکت مصر نے رومۃ الکبریٰ کی اطاعت کر لی -

سیزر عرصہ تک مصر میں بے فکری و عیش عشرت کرتا رہا - آخر کار ملکی ضرورتوں سے اُس کو روما واپس جانا پڑا - اور کلوپٹرا وادی نیل کی مطلق العنان فرماں روا ہو گئی -

انٹی پیٹر انٹی پیٹر نے بڑے نازک وقت میں مدد کی تھی - اُسکے گراں بہا خدمات کے عوض میں وہ یہودیاہ - سامرہ - اور گلیلی کے تمام ملکی اور مالی امور کا مہتمم و منتظم مقرر ہوا - ہرکینس ہیکل مقدس کا پیشوائے اعظم رہا لیکن کنعان کی حکومت درحقیقت انٹی پیٹر کو تفویض کی گئی - اُس کی سفارش سے یہود کو قوانین شریعت پر عمل کرنے کی اجازت ملی - وہ جبریہ فوجی خدمت سے معاف کیے گئے - سالانہ خراج میں کمی ہوئی - یروشلم کی فصیل دوبارہ بنانے کی ممانعت منسوخ کی گئی - انٹی پیٹر صوبہ ایدوم کا رہنے والا - کنعانیوں کا پڑوسی تھا - اُسکے آبا و اجداد نے بنی اسرائیل کی فرمانبرداری کی تھی اور شریعت موسوی کے پابند ہو گئے تھے - وہ مذہباً یہودی تھا مگر نسلاً اسرائیلی نہ تھا - جوئیس سیزر کی عنایت سے اسکو شاہی اختیارات حاصل ہوے تو وہ مذہب اور ملک کا بہی خواہ ثابت ہوا -

اُس نے علاقہ محروسہ کا دورہ کیا اور سب بد انتظامیاں دور کیں۔ اپنے لڑکے کو یروشلم کا گورنر مقرر کیا اور دوسرے لڑکے ہیرڈ کو گلیلی کا حاکم بنایا۔ ہیرڈ نوجوان ذہین شجاع اور ہونہار تھا، دبدبہ سے حکومت کی چوروں اور راہزنوں کو تہ تیغ کیا اور صوبہ میں امن قائم کیا۔ لیکن انٹی پیٹر کی حکومت رعایا کو پسند نہ تھی وہ دیکھتے تھے کہ بادشاہ ہرکینس بے اختیار ہے اور سیاہ و سفید کا انٹی پیٹر مختار ہے۔ ہیرڈ کی مطلق العنانی خصوصاً ناگوار تھی۔ اُس پر قتل و غارت کے الزام عاید کیے گئے اور اکابر قوم کی مجلس انتظامی کے سامنے جوابدہی کے لیے طلب کیا گیا۔ وہ اپنے باپ کے حکم سے الزامات کا جواب دینے حاضر ہوا مگر شام کے رومی گورنر کا ایک خط ہرکینس کے نام لایا جس میں متولی اعظم کو بحیثیت میر مجلس جلسہ انتظامی کے ہدایت کی گئی تھی کہ ہیرڈ کی مدد اور حفاظت کرے۔ کہتے ہیں کہ ہیرڈ جو ملزم کی حیثیت سے طلب کیا گیا تھا شہزادوں کی طرح شان و شکوہ سے مجلس میں آیا۔ وہ سرخ اباس پہنے تھا۔ بالوں کو پٹیاں بنی تھیں۔ اور مسلح محافظ اُسکے ساتھ تھے۔ یہ آن بان دیکھ کر اکابر خوف زدہ ہوے۔ فرد جرم سنانے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی اور وہ بری کر دیا گیا۔

اس واقعہ کے تین سال بعد آید و میوں کا پشت پناہ جولیس سیزر دار السلطنت میں قتل ہوا اور رومی دنیا میں ہلچل پڑ گئی۔

سیزر

سیزر مصر سے واپسی کے بعد رومۃ الکبریٰ کی وسیع سلطنت کا قائد اعظم (ڈکٹیٹر) مقرر ہو گیا تھا اور اُس کو تمام شاہی اختیارات حاصل تھے۔ وہ پانچ سو لڑائیوں میں کامیاب ہوا تھا۔ ایک ہزار شہر فتح کیے تھے اور ایک کروڑ سے زیادہ بنی آدم کا خون اُسکی گردن پر تھا۔ لیکن امن و سکون کی زندگی اُس کی قسمت میں نہ تھی۔ جب ملکی خطرے دُور ہوے۔ تخت و تاج کے راستے میں پھول بچھے۔ مجلس واضعان قوانین میں سونے کے تخت پر بیٹھا تھا اور عنقریب بادشاہی کا خطاب ملنے والا تھا کہ ایک دغاباز نے اُسکے سینے میں خنجر بھونکا۔ پانچ سات سازشی جھپٹ پڑے۔ وہ ۲۳ زخم کھا کر گرا اور مرگیا۔ یہ واقعہ ۴۴ھ قبل مسیح کا ہے۔

یہودنے مراسم تعزیت بجالانے کے لیے مجلس واضعان قوانین کی خدمت میں سفیر بھیجے اور قدیم مراعات و مناصب کی تجدید چاہی۔ روما میں اُس وقت پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ یہود کی درخواست منظور ہوئی۔ ہرکینس کی تولیت اور انٹی پیٹر کی حکومت بحال رہی۔ لیکن اسی زمانہ میں ایک ہر دلعزیز یہودی جنرل نے انٹی پیٹر کو زہر سے ہلاک کر دیا۔ ہیرڈ نے شام کے رومی گورنر سے شکایت کی۔ قاتل قصاص میں مارا گیا۔ اُس کی موت کا یہودیوں کو بہت رنج ہوا۔ ہیرڈ سے عام نارضی پیدا ہوئی اور

اس کے خلاف ایک درخواست قیصر متوفی کے شریک امارت مارک انٹنی کے پاس روانہ کی گئی۔

انٹنی | نوعمری میں انٹنی ایک معمولی فوجی سوار تھا۔ سیزر نے اُس کو باڈی گارڈ کے رسالہ میں لیلیا۔ آہستہ آہستہ اعلیٰ ملکی مناصب تک پہونچا یا اور اپنی امارت وحکومت کا شریک بنا لیا۔ سیزر کی موت کے وقت اُس کا بھتیجا آکٹویس روما میں موجود نہ تھا۔ لہذا متوفی کا کُل مال ومتاع انٹنی کے قبضہ میں آیا اور وہ رومۃ الکبرےٰ کا زبردست ترین مدبر ہوگیا۔

یہودیوں کی استدعا پر وہ شام آیا۔ شکایات سنیں اور انٹی پیٹر کی سابقہ خدمات کا لحاظ کرکے ہیرڈ کو اپنی حفاظت میں لیا۔ مگر وہ زیادہ قیام نہ کرسکا اور ملکی ضروریات سے اُسکو فوراً اطالیہ جانا پڑا۔ ہیرد کو زک ہوئی مگر چند ہی روز میں ایسا پانسا پلٹا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خفت مٹانے اور ادومیوں کو ستانے کا موقع مل گیا۔

اقوام پارتھیا | فارس کے شمال میں ترکمانوں کی ایک جنگجو قوم آباد تھی جو تاریخ کے صفحات پر "پارتھین" کے نام سے مشہور ہے۔ شام میں سکندر کے جانشین یونانی بادشاہوں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاکر اُنھوں نے ۲۵۰ ء قبل مسیح میں علم بغاوت بلند کیا تھا رفتہ رفتہ ایران وتوران کے کُل علاقے پر قابض ہوگئے اور تقریباً پانچسو برس تک فارس پر حکومت کی۔ اپنے عروج کے وقت اُنھوں نے رومۃ الکبرےٰ کے دانت کھٹے کردیے تھے اور رومی سپہ سالار کریسس کی اندوہناک پر شکست پر اس وقت تک روما کے مورخ آنسو بہاتے ہیں۔ اس قوم کے آخری بادشاہ اردوان کو ۲۲۶ء عیسوی میں ہلاک کرکے آردشیر نے دولت ساسانیہ کا بنیادی پتھر رکھا تھا اور عربوں کے حملے تک ایران پر ساسانیوں کی حکومت رہی۔

المختصر۔ انٹنی کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھاکر شامیوں اور یہودیوں نے ترکمانوں کو اپنے ملک پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ شام، فلسطین اور ایشا، کوچک پر پارتھیوں کا قبضہ ہوگیا اور اُن کی سرپرستی میں معزول شاہ یروشلیم ارسٹی بولس کا لڑکا انٹگونس بنی اسرائیل کا بااختیار بادشاہ ہوا۔ ہرکنیس گرفتار ہوا اور اُسکے بال کاٹ دیے گئے تاکہ وہ دوبارہ متولی اعظم نہ ہوسکے کیونکہ مو تراشیدہ ہیکل یہود کا متولی نہ ہوسکتا تھا۔ ہیرڈ کے بھائی نے قیدخانہ میں خودکشی کی لیکن ہیرڈ بچکر نکل گیا۔ اپنے اہل وعیال۔ مال ودولت کو محفوظ جگہ چھوڑکر روما پہونچا۔

جولیس سیزر کے قتل کے بعد روما میں جو فساد ہوے۔ قاتلوں سے جو سلوک کیا گیا۔ قیصر کے بھتیجے آکٹویس اور انٹنی سے جو جھگڑے بکھیڑے رہے اُنکی تفصیل سے ہماری داستان کو کچھ سروکار نہیں۔ البتہ

یہ جاننا چاہیے کہ جس وقت ہیرڈ خانہ برباد ہو کر دارالسلطنت پہونچا تو آکٹویس اور انٹنی کے حصہ میں آیا تھا اور مغرب دوسرے کو ملا تھا۔ باہمی تعلقات شگفتہ تھے۔ آکٹویس کی بہن آکٹویا سے انٹنی نے عقد کر لیا تھا اور امور مملکت دونوں سرداروں کے مشورے سے طے ہوتے تھے۔

ہیرڈ نے اپنی داستان غم انٹنی کو سنائی۔ اس نے آکٹویس کو اپنا ہمخیال بنایا اور مجلس و اعیان قوانین کے سامنے ان دونوں نے انٹی پیٹر مرحوم کے خدمات اور ہیرڈ کے مصائب کا پرزور الفاظ میں اظہار کیا۔ مجلس ملی نے متفقہ طور ہیرڈ کو کنعان کا عالم تسلیم کرایا۔ انٹگونس مجرم۔ قومی دشمن اور قابل سزا

ہیرڈ کی مسند نشینی

قرار دیا گیا اور یہ کل کارروائی بالکل اسی طرح ہوئی جیسے کسی ماتحت صوبہ کا انتظام کیا جاتا ہے۔ مجلس کے تصفیہ کے بعد ہیرڈ کی رسم مسند نشینی بھی وہیں ادا کر دی گئی۔ اور رومی دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں کی گئیں۔

حکومت کی ہوس میں ملک کی خود مختاری قربان کرنے کے بعد ہیرڈ فلسطین آیا۔ اس دوران میں رومی جنرلوں نے پارتھیوں کو شام سے بے دخل کر دیا تھا اور کنعان میں انکا اثر زائل ہو چکا تھا۔ ہیرڈ نے فوج جمع کی۔ انٹی گونس سے متعدد معرکے ہوئے۔ بدنصیب بادشاہ کو شکست ہوئی اور وہ یروشلم میں محصور ہو گیا۔ کنعان کا کل رقبہ ہیرڈ کے تصرف میں تھا۔ لیکن یروشلم کی وفادار رعایا اور مستحکم دیواروں نے تین سال تک شہر میں قدم رکھنے نہ دیا۔ اس نے رومی سپاہیوں سے مدد کی التجا کی اور انکی اعانت سے بہزار مشکل شہر فتح ہوا۔ رومی محاصرے کی طوالت سے برافروختہ تھے۔ انھوں نے فتح کے بعد قتل و غارت کا اعلان کیا۔ اندیشہ تھا کہ دارالحکومت بالکل تباہ ہو جائے گا مگر ہیرڈ نے اپنے معاونوں کو رقم کثیر دے کر اس بلا کو ٹالا۔ انٹی گونس گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا۔ مقابی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ انکے اعوان و انصار قتل کیے گئے اور انکی جائدادیں ضبط ہوئیں۔ متولی اعظم کا عہدہ وراثتاً ہرکینس کے لڑکے کو ملنا چاہیے تھا جو ہیرڈ کا سالا بھی تھا۔ اور ہر طرح اس منصب جلیلہ کا مستحق تھا مگر مقابیوں کی ضد میں بابل کے ایک اسرائیلی کو یہ مذہبی خدمت عطا ہوئی اور وہ لڑکا محروم کیا گیا۔ بیوی کو ناگوار ہوا۔ اس نے ہیرڈ کی خانگی زندگی تلخ کر دی اور اپنے بھائی کے حقوق کے لیے پوشیدہ تدبیریں شروع کیں۔ مصر کی ملکہ کلوپیٹرا کی خدمت میں نیاز حاصل تھا اس کی معرفت انٹنی سے سفارش چاہی۔

انٹنی اور کلوپیٹرا

انٹنی اور آکٹویس میں خشمک ہو گئی تھی۔ انٹنی ایک ملکی ضرورت سے مصر بھیجا گیا یہاں کلوپیٹرا کے حسن و جمال کا شکار ہوا اور اسکے دام عشق میں ایسا پھنسا کہ مصر کی بود و باش اختیار کر لی۔ اپنی بیوی آکٹویا کو طلاق دی۔ ایشیا کے مقبوضہ صوبے ملکہ مصر کی

نذر کیے ۔ فتح و ظفر کا جشن اسکندریہ میں منایا اور شب و روز عیش و عشرت میں مستغرق رہنے لگا ۔ کلوپٹرا کے اشارے سے اُس نے ہیرڈ کو تولیت کا انتظام منسوخ کرنے پر مجبور کیا اور اس طرح ہزار خرابی ہرکنیس کا لڑکا ارسٹی بولس متولی اعظم کے منصب پر سرفراز ہوا ۔ چند ہی روز میں اس قدر ہردلعزیزی حاصل کی کہ ہیرڈ رشک کرنے لگا اور اُس کے خون کا پیاسا ہوگیا ۔ ارسٹی بولس ایک دن حوض میں غسل کر رہا تھا کہ ہیرڈ کے اشارے سے غرق کر دیا گیا ۔ اکابر یہود سخت ناراض ہوئے ۔ کلوپٹرا کو اس جرم کی اطلاع دی گئی ۔ وہ ہیرڈ سے پہلے ہی ناراض تھی کیونکہ اُسنے چند سال ہوئے ملکہ مصر کے پیام محبت کی قدر نہ کی تھی ۔ اب اُسے بدلہ لینے کا موقع ملا اور انٹنی سے اصرار کیا کہ ارسٹی بولس کے قصاص میں ہیرڈ قتل کیا جائے ۔ انٹنی کی مجال نہ تھی کہ ملکہ کے احکام سے سرتابی کرے ۔ مگر ہیرڈ کی زندگی باقی تھی ۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں سلطنت روما نے انٹنی کے شرمناک حرکات سُن کر ملکہ کلوپٹرا کے خلاف اعلان جنگ کیا ۔ یہ لڑائی دراصل انٹنی کے خلاف تھی کیونکہ وہی مدار الہام تھا اور جنگ کا باعث یہ تھا کہ آکٹویس نصف سلطنت پر قانع نہ تھا وہ انٹنی کو تباہ کرکے تمام متمدن اور مہذب دنیا کا مطلق العنان بادشاہ بننا چاہتا تھا ۔ انٹنی کو روپیہ کی ضرورت تھی ۔ ہیرڈ نے رشوت دے کر اپنی جان بچائی اور یروشلم پر بدستور حکومت کرتا رہا ۔

انٹنی نے جزیرہ ساموس کے قریب اپنا بیڑہ جمع کیا ۔ دو لاکھ پیادے اور بارہ ہزار سوار اسکی رکاب میں تھے ۔ چھ سلطنتوں کے بادشاہ بہ نفس نفیس ہمراہ تھے اور یروشلم وغیرہ پانچ ریاستوں کی فوجیں اُس کی قیادت میں تھیں ۔ پانچ سو جہازات عجیب و غریب نمونوں کے جمع تھے ۔ جن میں سے بعض میں متعدد درجے اور برج و مینار تھے ۔ کلوپٹرا کی کشتی سب سے زیادہ خوبصورت تھی ۔ اُسکے گلابی جھنڈے اور سرخ بادبان ہوا میں لہراتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ سونے کا محل شفق کے نیچے حرکت کر رہا ہے ۔ انٹنی کا جہاز بھی قریب قریب ایسا ہی آراستہ تھا ۔ فوجی باجے بجتے تھے اور اُن کی ولولہ خیز موسیقی کے ترانے آسمان تک پہونچتے تھے ۔ مورخ لکھتے ہیں کہ دنیا نے اس بیڑے سے زیادہ شاندار اور دلکش اور باعظمت فوجی منظر کبھی نہیں دیکھا ۔ متوالی ملکہ عارضی شوکت و حشمت سے مدہوش ہوکر تمام عالم میں اپنا کوئی مقابل نہ سمجھتی تھی ۔ اور رومیوں کے دار السلطنت کو تباہ کرنیکا گھمنڈ رکھتی تھی

آکٹویس کے پاس اسکے نصف جہاز بھی نہ تھے اور صرف ۸۰ ہزار پیادے ہمراہ تھے لیکن انٹنی کے ملاح ناآزمودہ کار قالین کے شیر تھے ۔ تجربہ کار جنرلوں نے صلاح دی کہ وہ سمندر میں جنگ نہ کرے کلوپٹرا کو مصر بھیجدے اور خشکی میں دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہو مگر جس کو خدا تباہ کرنا چاہتا ہے پہلے اُسکی

عقل سلب کر لیتا ہے۔ عشق و محبت کا مجنون کلوپٹرا کو آزردہ نہ کر سکتا تھا۔ ملکہ نے بحری جنگ کی رائے دی اور اُسکے ارشاد کی تعمیل واجب تھی۔

۲۔ستمبر ۳۱ سنہ قبل مسیح کو شہر اکتیم کے قریب لڑائی شروع ہوئی اور دُنیا کی حکومت کا پانسا پھینکا گیا نازک مزاج معشوق نگہت گُل سے بروماغ ہوتے ہیں، اور شور بلبل بار خاطر ہوتا ہے۔ قتال وجدال کا شور و ہنگامہ کلوپٹرا سے کیسے دیکھا سنا جاتا۔ جب لڑائی پورے زور پر تھی اور قریب تھا کہ مصریوں کو فتح نصیب ہو کلوپٹرا کا دل گھبرایا اور مصری بیڑے کے ساٹھ جہاز اپنے ہمراہ لیکر وطن کی سمت واپس ہوئی۔ انٹنی نے معشوق کے جہازات مصر کی طرف جاتے دیکھے تو سودائے محبت میں دنیا کی سلطنت کو طاق پر رکھ کر خود بھی اُسی کے عقب میں روانہ ہوا۔ خشکی کی عظیم الشان فوج نے یہ حیرت انگیز تماشہ دیکھ کر ہتھیار رکھدیے اور آکٹویس کی اطاعت قبول کرلی۔ لڑائی ختم ہوئی اور انٹنی کی بزدلی اور حماقت سے آکٹویس کامیاب ہو گیا۔

انٹنی کی شکست سن کر کلوپٹرا کی نیت بدلی۔ اُس نے آکٹویس کو اپنے دام محبت میں گرفتار کرنے کا عزم کیا۔ اس کوشش میں ناکام ہوئی۔ ذلت و رسوائی کا خطرہ ہوا تو ایک تہ خانہ میں پوشیدہ ہوکر اپنی موت کی خبر مشہور کی۔ انٹنی نے یہ سُن کر اپنے سینے میں خنجر بھونک لیا اور اُس کی لاش پر کلوپٹرا نے بھی خودکشی کرلی۔ مشہور ہے کہ سانپ سے کٹوا کر جان دی۔ بہر حال آکٹویس روم الکبریٰ کی وسیع مملکت کا تنہا حاکم و مختار ہو گیا۔

ہیرڈ کی کامیابی

ہیرڈ نے مبارکباد کی نذر پیش کی اور خوشامد و چاپلوسی سے آکٹویس کو اپنے حال پر ویسا ہی مہربان بنا لیا جیسا کہ انٹنی تھا۔

بیرونی خرخشوں سے مطمئن ہو کر ہیرڈ نے اپنی حکومت کو مستقل اور شاندار بنانے کی کوشش کی۔ اُسکے دَور میں کنعان کو وہ سرسبزی اور فلاح نصیب ہوئی جو مدت سے معدوم تھی۔ مملکت میں عالیشان قلعے تعمیر ہوے۔ دارالسلطنت میں وسیع محل بیش قیمت سامان اور مسالے سے تیار ہوا۔ رومی کھیل تماشے یروشلم میں جاری ہوے۔ تہذیب و تمدن میں ترقی ہوئی لیکن بنی اسرائیل اُس سے بدستور ناراض تھے۔ کیونکہ وہ نسلاً ایدومی تھا اور ایک اجنبی طاقت کے زیر اثر حکومت کرتا تھا۔

ہیرڈ نے ہیکل مقدس کی عمارت از سر نو بنانے کا ارادہ کیا کیونکہ بابل کی اسیری سے واپسی کے بعد افلاس کے زمانہ میں موجودہ عبادت خانہ تعمیر ہوا تھا اور اُسکا مسالا ناقص اور کم قیمت

تھا۔ اکابر قوم تعمیر جدید کے خلاف تھے۔ جب تک نئی عمارت کے لیے کل سامان فراہم نہیں کر دیا گیا ہیرودس نے قدیم معبد کو مسمار کرنے کی اجازت نہ دی۔ آٹھ سال میں جدید عمارت تیار ہوئی جو یونانی طرز کی خوبصورت، دلکش اور وسیع تھی۔ بیش قیمت سنگ مرمر استعمال کیا گیا اور بے دریغ روپیہ صرف کیا گیا۔ اس بلند ہمتی سے اسرائیلی خوش ہوئے اور ہیروڈ کو کسی قدر ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ لیکن اُس کے اعزہ اور رشتہ دار ہنوز خفا تھے۔ ایک روز غصہ میں بیوی کے قتل کا حکم دیا۔ اُس کی اولاد کو بھی ہلاک کیا۔ دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ سکون قلب کے لیے متعدد شادیاں کیں لیکن حقیقی راحت میسر نہ آئی۔ ہر وقت اپنی جان کا اندیشہ رہتا تھا۔ اور جس بدنصیب پر شبہ پیدا ہوتا تھا وہ فوراً جلاد کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔

آخر کار سنہ ۴ قبل مسیح میں سخت بیمار رہا۔ بستر مرگ پر اپنی ریاست بیٹوں میں تقسیم کی۔ ارخلاؤس کو ایڈوم۔ یہودیہ اور سامریہ کی حکومت دی۔ ہیروداس کو گلیلی کا حاکم بنایا اور فلپ کو اتوریہ وغیرہ متفرق صوبے عنایت کیے۔

ارخلاؤس کا دارالحکومت یروشلم تھا۔ اُسکے ظلم و جور سے عاجز آ کر یہودیوں نے روماۃ الکبریٰ کے شہنشاہ سے شکایت کی۔ ارخلاؤس معزول ہوا۔ جلاوطن کیا گیا اور یروشلم کی حکومت ایک رومی گورنر کے سپرد ہوئی۔ یعنی سنہ ۶ء سے سلطنت کنعان کی حیثیت باجگزار ریاست کی بھی نہ رہی بلکہ وہ سلطنت روما کا ایک معمولی صوبہ بن گئی۔

غزل شیخ ارشاد حسین صاحب واثق وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد دکن

کیف حج کا سا مجھے اجمیر کے آنے میں ہے
خم میں بھی آخر وہی مے ہے جو پیمانے میں ہے

ہاں مرے ساقی ترے بذل و عطا کے میں نثار
میری قسمت کا کوئی قطرہ بھی میخانے میں ہے

تشنہ لب ہوں اک غضب میں حلق کے کانٹے مرے
بھول اے ساقی مجھے دینا جو پیمانے میں ہے

ساقی تھوڑی بھی بہت ہے تیرے میخانے کی مے
مجھکو سو خم سے سوا ہے جو ترے پیمانے میں ہے

اُٹھ گئی پھر ساقیِ اجمیر کی آنکھ اس طرف
مژدہ میخوارو کہ اذنِ عام میخانے میں ہے

اللہ اللہ مجھ سا تشنہ کام بھی کہتا ہے آج
سب مرے حصہ کا ہے جو کچھ کہ میخانے میں ہے

دور سے آیا ہے واثق آجکل اجمیر میں
طور سے اُتری ہوئی مے اُسکے پیمانے میں ہے

کلامِ ریاض

(جناب سید محمد محسن رضوی صاحب ایم اے)

یہ تحریر جب وصول ہوئی تھی اُس وقت محسن صاحب الہ آباد یونیورسٹی میں ایم اے (اُردو)
کے آخری سال میں پڑھ رہے تھے۔ افسوس ہے کہ اس موضوع پر مضامین کی جو کثرت رہی
اُسکے سبب اسکی اشاعت بہت دیر میں ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ اس اثناء میں وہ ایم اے کامیاب
ہوگئے ہوں گے۔
ایڈیٹر

دو باتیں شایقین ادب اُردو کا دل سخت دُکھاتی ہیں۔ ایک تو عوام الناس کا اُردو کی قرار واقعی قدر نہ کرنا' دوسرے اس زمانہ میں ذی استعداد شعرا کی فی الجملہ قلت۔ ایسی حالت میں جب کوئی ایۂ ناز شاعر دنیا سے اُٹھ جاتا ہے تو درد دل میں سوا ہوتا ہے' ۳۰ جولائی ۱۹۳۴ء کو حضرت ریاض نے جو آجکل جانِ سخن سمجھے جاتے تھے دنیا کو خیر باد کہکر اُردو سے ذوق رکھنے والے طبقہ کو ایسا غم دیا کہ اب اُنکی آنکھوں میں "گویا نہ آسمان نہیں وہ زمیں نہیں"

ریاض کی فطرت میں قدرت نے ملکۂ شاعری ودیعت کیا تھا' اپنے وطن خیر آباد کے مدرسۂ عربیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ یکایک طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل ہوگئی اور ابتدائی مشق کے زمانہ میں دماغ سوزی سے کام لیکر ایسے شگفتہ اشعار نکالے کہ قبول خاطر ہوے۔ نصیب سے امیر سا اُستاد ملا جس نے ان کی خداداد طبیعت کو اور بھی سنوار دیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ شاعری کا ذوق بھی ترقی کرتا گیا۔ شعر و سخن کے نام سے ایک پرچہ "گلکدۂ ریاض" جاری کیا جس میں انکی غزلیات شایع ہوکر لوگوں کے سامنے آنے لگیں۔ اس پرچہ نے ان کا نام وطن سے باہر بھی مشہور کر دیا' یہاں تک کہ ان کی روز افزوں شہرت کا غلغلہ نواب کلب علی خاں والی رامپور کے کانوں تک پہونچا جنکے دربار میں اُسوقت منیر و جلال' امیر و داغ کے سے مشاہیر فن جمع تھے۔ نواب صاحب نے انھیں بھی طلب فرمایا اور از راہ قدردانی خلعت و انعام سے سرفراز فرمایا۔ لیکن بوجوہ چندے وہاں قیام نہ کر سکے اور بہت جلد اپنے وطن واپس آکر خدمت زبان میں منہمک ہوگئے حقیقت یہ ہے کہ زبان و ادب کی خدمت کسی دربار کے دائرہ تک محدود نہیں بلکہ دربار سے علٰحدگی میں بھی سچی خدمات انجام دینے کا موقع دستیاب ہوتا ہے۔

ریاضؔ نے زبان کے ساتھ قابل ستایش ریاضت کی اور عمر کے مختلف حصوں میں برابر علمی جد و جہد جاری رکھی۔ متعدد رسائل و جرائد مثل فتنہ، عطر فتنہ، ریاض الاخبار کے مختلف مقامات سے جاری کیے لیکن بدقسمتی سے انھیں عمریں بھی کم نصیب ہوئیں۔ امیر اللغات، اوردو، اوین امیر پر جو اعتراضات اور نکتہ چینیاں کی گئیں اُن کے معقول و شافی جوابات مسلسل دو برس تک ریاض الاخبار میں شایع کرتے رہے جس سے انکی سخن سنجی اور قوت تنقید کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں بارہ بنکی سے ایک ماہانہ رسالہ اعجاز جاری کیا جس میں اُن کے گراں مایہ ادبی و تنقیدی مقالات و غزلیات شایع ہوتی تھیں لیکن یہ پرچہ بھی زیادہ عمر حاصل نہ کر سکا اور دو ہی برس میں اُسکا پیمانہ حیات لبریز ہو گیا۔

ریاضؔ کو زندگی میں اطمینان کم نصیب ہوا اور مختلف پریشانیاں ہمیشہ دامنگیر رہیں جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

دنیا کے مخمصوں سے ہمیشہ رہا اُداس پر آدمی ریاضؔ بڑی دل لگی کا تھا

اُنھیں قسمت و ناچاری نے ایسا مجبور کر دیا تھا کہ خلاف ضمیر باتیں کرنا پڑتی تھیں اور اس سے اُن کے شیشۂ دل کو سخت چوٹ لگتی تھی ؎

سرا جھکانا مرا تقدیر سے سب کے آگے کوئی بھی ہو مجھے شرمندۂ احساں ہونا

زمانۂ قدیم سے تنگدستی ہمارے شعرا کے حال پر ایسی عنایت فرما رہی ہے کہ آج تک ساتھ نہیں چھوڑا۔ شعرا بھی اُس کے اس احسان کا برابر شکریہ ادا کرتے آئے ہیں چنانچہ موجودہ شعرا میں سے جناب آرزو فرماتے ہیں ؎

سخت تر سنگ سے ماتھے کی لکیریں نکلیں لکھا قسمت کا مٹایا نہ جبیں سائی نے

اور ریاضؔ اپنی قسمت کا رونا یوں روتے ہیں ؎

رہا تقدیر کا رونا ہمیشہ ہماری عمر تو گزری اسی میں

مہاراجہ محمود آبادؔ[1] مرحوم نے کچھ عرصے تک انکی ذاتی قابلیت کی بنا پر دستگیری کی۔ ریاضؔ نے اسے بہت غنیمت جانا اور اُنکے اس احسان کے عوض میں اپنے بعض اشعار میں اُنکی تعریف بھی کی ؎

جبہہ سائی جس نے کی قسمت چمک اٹھی ریاضؔ حضرت ساحرؔ کے در سے کیوں ہمارا سر اُٹھے

[1] مہاراجہ مرحوم کا تخلص تھا۔

ایک اور شعر میں فرماتے ہیں   پاؤں پر حضرتِ ساحر کے رہے سر میرا

لیکن اس کا کیا علاج کہ مہاراجہ صاحب کی ناوقت موت نے اس سلسلہ کو بہت جلد توڑ ڈالا۔ ورنہ ممکن تھا کہ ریاضؔ کو ایک گونہ اطمینان حاصل ہوتا اور فکرِ سخن کا زیادہ موقعہ ملتا۔

ابتدائے عمر میں ریاضؔ کو مشاعروں میں شریک ہونے کا بڑا شوق تھا۔ خواجہ عشرتؔ "آبِ بقا" میں لکھتے ہیں "کوئی مشاعرہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں یہ شریک نہ ہوتے تھے" مشاعروں کے سلسلہ میں اُنھیں کئی شہروں میں جانے اور قیام کرنے کا موقع ملا اور ہر جگہ اپنی ظرافت و بذلہ سنجی سے سے قدردان پیدا کر لیے اس اعتبار سے لکھنؤ اور گورکھپور قابلِ ذکر ہیں خصوصاً گورکھپور میں تو قریب قریب اُن کی جوانی گزری۔ وہ اس شہر کے والہ و شیدا تھے۔ چنانچہ گورکھپور کی شان میں ایک غزل بھی کہی ہے جسکا مطلع یہ ہے ؎

ہوئی ہے میری جوانی فدائے گورکھپور   لحد سے آئیگی آواز ہائے گورکھپور

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں گورکھپور سے کس قدر الفت تھی اسی غزل کے چند شعر مندرج ہیں جس سے اس حقیقت کا اور زیادہ اظہار ہوتا ہے ؎

یہاں کی موت بھی ہے زندگانی جاوید   ہوا ہے باغِ جناں ہے ہوائے گورکھپور
پرستش انکی ہمارا تو دین و ایماں ہے   عجیب چیز ہیں اہلِ وفائے گورکھپور
ہم اپنے خونِ تمنا سے سینچ آئے ہیں   حسیں لگائیں نہ کیونکر حنائے گورکھپور
نہ مٹ سکیں گے کبھی نقش بھولی باتوں کے   ہمارے دل میں بسی ہے ادائے گورکھپور

ریاضؔ پرانی وضع اور تہذیب کے آدمی تھے اور خلق و مروت کا گویا مجسمہ ؎

پُرانی چیزوں میں ہے اک خُمِ گلی میرا   پُرانے لوگوں میں یہ خاکسار باقی ہے
مرا یہ خُم ہے پُرانا خُمِ فلاطوں سے   پُرانے وقت کی یہ یادگار باقی ہے

نئی روشنی انکی وضعِ قدیم پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ڈال سکی وہ دورِ حاضر کے شاکی نظر آتے ہیں کہ اس نئی روشنی نے ایمان رخصت کر دیا ؎

کیا زمانہ ہے کہ دشوار نظر آتا ہے   لاکھ دو لاکھ میں بھی صاحبِ ایماں ہونا

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

کس قدر ہیں اثر اندازِ بتانِ کافر   اس زمانے میں بہت ہے جو خدا یاد رہے

طبیعت میں بذلہ سنجی و ظرافت زیادہ تھی اور شوخی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جو آخر عمر

تک نہ گئی۔ اُنکے ایک محب خاص نے لکھا ہے کہ "وہ پیرانہ سالی میں بھی اس قدر شوخ تھے کہ متین بننا چاہتے تھے مگر نہ بن سکتے تھے" انکی آخر عمر کا یہ شعر انکی شوخی کا آئینہ ہے ؎

ریاض اب شکل بھی بدلی مذاق طبع بھی بدلا — یہ سن کا ہے تقاضا جو خیالِ حور آتا ہے

اس شعر کی بھی شوخی ملاحظہ ہو ؎

سنتے ہی میرا شعر وہ یہ کہہ کے اُٹھ گئے — اس عمر میں بھی ان کی طبیعت جوان ہے

ان کی شاعرانہ شوخی کے متعلق یہ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس صفت میں یہ غالب اور داغ سے بھی بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ ان دونوں کی شوخی صرف ایسی ہوتی ہے جو زیر لب مسکراہٹ بن جاتی ہے لیکن ریاض کی شوخی اس پہ اکتفا نہیں کرتی اور پڑھنے والے کو بغیر اچھی طرح ہنسائے نہیں رہتی۔ مثال کے لیے غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام — قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

اسکے مقابلہ میں ریاض کا یہ شعر ملاحظہ ہو

وہ آرہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ — بہا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھاہ ملے

لوٹتے ہیں لطف آنکھوں میں فرشتے ساتھ کے — ان فرشتوں سے بھی اب چھپ چھپ کے ہم عصیاں کریں

ذرا سے ورد نے ڈھائی ہیں آفتیں کیا کیا — ٹپک دیا ہے زمیں پر اُٹھا اُٹھا کے مجھے

یہ کہنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا ہے کہ شوخی کے اعتبار سے بسا اوقات یہ ظریف کے ہم رنگ ہوجاتے ہیں موخر الذکر شعر کو ذہن میں رکھ کر ظریف کا یہ شعر پڑھیے اور دیکھیے کہ دونوں کس قدر ہم آہنگ ہیں ؎

خدا غارت کرے ایسے جنونِ فتنہ ساماں کو — وفورِ بےخودی میں یار کو دے دے ٹپکتا ہوں

شراب وساقی کے متعلق ابتدا ہی سے ہمارے شعرا خیال آفرینی کرتے رہے ہیں اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض نے اس میں کیف واثر بھی پیدا کر دیا ہے۔ ریاض کی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے اس قسم کے مضامین کثرت سے نظم کیے اور اُن میں تنوع پیدا کردیا ہے۔ عموماً اُنکے اس قسم کے اشعار اگرچہ کسی قدر بےکیف سے ہوتے ہیں لیکن بعض ایسے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پکے شرابی کے حقیقی جذبات ہیں جو ریاض کے قلم نے نظم کر دیے ہیں۔ لطفِ مینوشی کو وہ ایک خاص انداز میں بیان کرتے ہیں اور قرض کی پینے میں انھیں خاص لطف آتا ہے ؎

ہم جانتے ہیں لطف تقاضائے مےفروش — وہ نقد میں کہاں جو مزا ہے اُدھار میں

قرض پی آئے اک دکان سے آج		نیچی داڑھی نے آبرو رکھ لی

اگر ساقی نیچی داڑھی کی بھی رعایت نہیں کرتا اور قرض دینے سے انکار کرتا ہے تو انھیں جنت سے بھی ننگ و عار نہیں ؎

دیدے دیدے مرے ساقی ترے صدقے دیدے		دستِ سیمیں سے چھلکتے ہوئے پیمانے سے

قدح خواری کے نئے ظرف ملاحظہ ہوں ؎

ہمارے شیشہ و ساغر ہیں یہ مہ و خورشید		ہمارے پینے کا اک خُم ہے آسمان نہیں

انتہائے شوق مینوشی کا یہ عالم ہے کہ بعد مرگ بھی اُسی کی تمنا کرتے ہیں ؎

کھلیں قبر میں جنت کی کھڑکیاں رندو		دماغ میں جو بسی ہے اُسی کی بو آئے

بلکہ ایسی پی کے دنیا سے جاتے ہیں کہ حشر کے دن بھی خمار باقی رہتا ہے ؎

یہ کیسی پی کے گئے تھے لحد میں سوئے ہم		کہ آج حشر کے دن بھی خمار باقی ہے

انھیں خمریات کے باعث معاصرین نے انھیں "خیّام الہند" کا خطاب بھی عنایت کیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اردو شعرا میں کسی پر یہ خطاب زیب دیتا تھا تو وہ ریاضؔ کی ذات تھی ؎

'درسخن پنہاں شدم مانند بو در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا'

پر یقین رکھنے والے بلا خوف تردید کہدیں گے کہ ریاضؔ ایک پکّے مے آشام تھے۔ کیونکہ جو شخص ایسے شعر کہتا ہو کہ ؎

نظر بچائے بغل میں دبائے شیشۂ مے		کہیں ریاضؔ بھی پینے پلانے جاتے ہیں

ہے ریاضؔ اک جوانِ مست خرام		نہ پیے اور جھومتا جائے

یا اس سے بڑھکر یہ کہ ؎

ریاضؔ ہائے رے تیرا وہ خواب کا انداز		سبو تو سر کے تلے دستِ شوق ساغر پر

نا ممکن ہے کہ تر دامنی سے پاک ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ انکی یہ سب باتیں صرف زبانی تھیں، پینا تو درکنار دُختِ رز کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔

خمریات تو ریاضؔ کی شاعری کا خاص رنگ ہے لیکن وہ زاہد و شیخ کی خبر لینے سے بھی غافل نہیں رہے۔ اور یہ انکی شوخیٔ طبع کا مقتضا تھا۔ انکی شوخی نے زاہد صورتوں اور پارسا وضعوں کا تو کیا ذکر ہے "یہ اہلِ صومعہ چھپ چھپ کے کیا نہیں کرتے" حسینوں پر بھی جا بجا چوٹیں کی ہیں۔ یہ

دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ابھی چپ ہوں محشر میں افشا کروں گا حسینوں کے رازِ نہاں کیسے کیسے

ہے شکل میری مقدس تو یہ پوچھتے ہیں حسیں انھیں بھی کیا کوئی دنیا کا کام آتا ہے

معاملات عشق میں وہ معشوق سے دب کے نہیں رہتے، تیوریاں چڑھانے سے ڈرتے نہیں بلکہ خود دھمکی دیتے ہیں ؎

میں ڈرتا ہوں یہ کہہ کے حسینوں کو ریاض جو نہ پورا ہو وہ ارمان مرے دل میں نہیں

وصل کی شب نہ چلی ایک بھی شوخی اُنکی کچھ نہ بن آئی تو چپکے سے کہا مان گئے

اس بات میں بھی ریاض کا قدم بہت آگے بڑھ گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آج تک معشوقوں نے جتنے ستم عاشقوں کی جان پر ڈھائے ہیں وہ ان سب کا انتقام لیتے ہیں۔ دیگر شعراء کے کلام میں عاشق معشوق کی ناز برداریاں کرتا نظر آتا ہے لیکن ریاض معشوق سے بھی نازک مزاج تر ہیں۔ بہت جلد روٹھ جاتے ہیں اور پھر معشوق انھیں منانے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

چھیڑ کیسی بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاض اک حسیں ہر وقت ہو انکو منانے کے لیے

ہم سے دیوانے ریاض اور کہاں نازک طبع کہ جو وہ پھول سے بھی ماریں تو فریاد کریں

ریاض نے شیخ و ناصح کی ایسی خبر لی کہ اُسکا شہرہ شہر لندن تک جا پہونچا۔ چنانچہ جناب ہادی صاحب لکھنوی نے جب اُنکا یہ شعر ؎

ناصح کے سر پہ ایک جمائی تڑاق سے پھر ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

ایک تقریر کے سلسلہ میں وہاں بیان کیا تھا تو اس کی وضاحت پر تمام ہال چیرز سے گونج اُٹھا تھا بلکہ اس شعر کو وہاں ایسا حسن قبول حاصل ہوا تھا کہ اخبارات میں بھی اسکی تعریف پُر زور الفاظ میں کی گئی تھی۔ اسی زمرہ کے اور چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

دل نہ مانا حضرتِ واعظ کو آتا دیکھ کر کچھ یوں ہی تھوڑی سی پی لی دل لگی کے واسطے

منبر نہیں ہے تختِ شہی ہے یہ وقتِ وعظ واعظ نہیں ہے جھوٹوں کا یہ بادشاہ ہے

حبیب سے غافل حرم والو نہیں رہنے کا وہ آئینوالا کچھ بہت ہی ہوشیار آئینو ہے

ریاض شوخ غزل گوئی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ جس کی مثال اُنکی ہر غزل میں قدم قدم پر ملتی ہے اسے ایک طرف رکھ کے اگر ان کی غزلیات پر نظر ڈالی جائیگی تو درد۔ تغزل۔ سوز و گداز۔ تاثیر اور بلندی خیالات وغیرہ کی ایسی مثالیں بھی ملیں گی جنھیں ہم اردو شاعری کا

اعلیٰ نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ تغزل دراصل غزل کی جان ہے اور جب کبھی اسکا ساتھ حسن بیان سے ہوتا ہے تو شعر کا درجہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار اس اعتبار سے خاص طور پر قابل ملاحظہ ہیں ؎

نالہ نالہ رہے۔ فریاد نہ فریاد رہے — کوئی کہہ جائے کہ ناشاد مرا شاد رہے
سمجھ کر سرگزشت غیر انکو لطف آتا ہے — سنا کرتے ہیں پہروں منہ سے میرے داستاں میری
کیوں مجھے رخصت کریں کیوں حشر کا ساماں کریں — نزع میں کیوں آئیں مجھ پر آپ کیوں احساں کریں
اجڑے دل میں گشت کرتا ہے حسینوں کا خیال — وہ پری خانہ ہے جس گھر کو حسیں ویراں کریں
کیوں اڑے پھرتے ہیں مجھسے دل ہدف کیونکر بنے — رخ ذرا میری طرف بھی ناوک مژگاں کریں
جفا میں نام نکالو نہ آسماں کی طرح — کھلیں گی لاکھ زبانیں مری زباں کی طرح
ہم ہو کے سیہ مست لپٹتی ہیں بلائیں — بے تیرے مزا اے شب ہجراں نہیں ہوتا
کچھ آئینہ نے اور ہی عالم دکھا دیا — دونوں کو ایک دوسرے نے کیا بنا دیا
وہ ستاتا ہے ستاتے جو نہیں تم مجھ کو — دھوکے دیتا ہے بری طرح توہم مجھ کو

اسی تخئیل سے ملتا جلتا تسنیم کا بھی شعر ملاحظہ ہو ؎

وجہ جمعیتِ خاطر سروساماں نہ ہوا — دل ہوا اور پریشاں جو پریشاں نہ ہوا

ہمارے شعراء کے دواوین میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں درد و غم اور رنج و بیکسی کا اظہار کیا گیا ہے اور جو باعث انقباض ہوتے ہیں خصوصاً حضرت عزیز لکھنوی کا کلام۔ لیکن اسکے برخلاف ریاض کے کلام کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس میں خوشی و مسرت کا اظہار کیا گیا ہے اور جو باعث انشراح و انبساط ہوتا ہے۔ ذیل میں اس قسم کے اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

بہار آتے ہی پھولوں نے چھاؤنی چھائی — کہ ڈھونڈتا ہوں مجھے آشیاں نہیں ملتا
دام اس رنگ سے گلشن میں بچھا نا صیاد — میں سر شاخ چلوں سایہ تہ دام رہے
گلوں کے بھیس میں شکلیں ہیں مہ جبینوں کی — یہ ڈالیاں ہیں کہ ہیں ڈولیاں حسینوں کی
مزہ ہو کہ جھک جھک کے رہ جائے بجلی — گلوں سے چھپا ہو نشیمن کسی کا
گیا چمن میں تو جھک کر بہت ملیں شاخیں — لیا گلوں نے مجھے میرے آشیاں کی طرح

لیکن ریاض جب درد انگیزی کی طرف مائل ہوتے ہیں تو شعر میں ایسی تاثیر بھر دیتے ہیں کہ سننے والا تڑپ جاتا ہے ؎

ہنگام نزع گریۂ عجب بیکسی کا تھا　　　تم ہنس دیے یہ وقت بھلا کیا ہنسی کا تھا
اٹھاؤ پھول کہ بستر بنے گا بستر مرگ　　　نہ رات کچھ ہے نہ اب انتظار باقی ہے
آرزو کا ہارے یہ کہنا کسی مایوس سے　　　اب چلے ہم بھی خدا حافظ بہت دل میں رہے
سوکھے ہوئے مرجھائے ہوئے پھول لحد پر　　　آجاتے ہیں دو چار کبھی اڑکے ہوائیں

ریاض نے غزل میں مضمون آفرینیاں بھی کی ہیں لیکن تغزل کے سررشتہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور داخلی پہلو کا رنگ دے کر مضمون کو خوبصورت بنا دیا ہے جس سے اشعار دائرۂ غزل سے باہر نہیں ہونے پائے بلکہ ان میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے ؎

خون میں ڈوبی ہوئی نبضیں ہیں نازک نازک　　　مہندی کے رنگ کی موجیں کف قاتل میں نہیں
چھپ کے وہ میری نگاہوں سے مرے دل میں رہے　　　شمع خلوت میں رہی پروانے محفل میں رہے
یہ بن بن کر حباب نرگس ستانہ آتا ہے　　　کف گلرنگ پر ساقی کے کیوں پیمانہ آتا ہے
گلے مل کر جھکی۔ جھک کر رکی۔ رک کر کھنچی قاتل　　　تری شمشیر کو بھی ناز معشوقانہ آتا ہے
لطف ہے مقتل میں چمکیں آج دو دو بجلیاں　　　آستیں تو چڑھ چکی ہے تیغ بھی عریاں کریں

ان کا شہباز فکر جب بلندی کی طرف پرواز کرتا ہے تو اعلیٰ مضامین شکار کر لاتا ہے۔ ان چند شعروں کی علوئے تخیل قابل ملاحظہ ہے ؎

اس نزاکت سے مہ نو کا نمایاں ہونا　　　چاہتا ہے کوئی نازک سا گریباں ہونا
کتنے کعبے ملے رستے میں کئی طور ملے　　　ان مقامات سے ہم کو وہ بہت دور ملے
سحر ہوتے وہ اپنا چاک دامن لیکے بیٹھے ہیں　　　رفو کرنے کو تار دامن مریم نکلتا ہے
جہاں ہم خشت خم رکھدیں بنائے کعبہ پڑتی ہے　　　جہاں ساغر پٹکدیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

ریاض کی شاعری میں ان کی زبان بھی خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ وہ الفاظ سادہ اور سلیس استعمال کرتے ہیں۔ اشعار میں سبک خنکی پائی جاتی ہے اور عموماً صاف و سادہ ہوتے ہیں زبان پر انھیں قدرت کاملہ حاصل تھی انداز بیان تکلف اور تصنع سے پاک ہے اور آمد نمایاں ہے۔ محاورے اس قدر آسانی کے ساتھ نظم کر جاتے ہیں کہ یہ انکے آگے ایک کھیل معلوم ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہم کو نہیں چین آگ لگے سوز دروں کو　　　ٹھنڈے ہیں چراغ سر تربت بھی ہوائیں
مے چرانے میں کہیں ہے ید طولےٰ کیا　　　ہم اڑا لائے سبو آج اچھوتا کیا

بلا کر بام پر فریاد تم سنتے ہو نادان ہو / کہو کیا ہو جو اب سے دور سن لے آسماں میری
لگا لاتے ہیں اپنے ساتھ یہ گم کردہ راہوں کو / ہمارے رہنما ہیں پاس جو رہزن کے بیٹھے ہیں
بھرے خُم کی طرح ہم میکدہ سے اُٹھ نہیں سکتے / یہاں بھی ہم جو بیٹھے ہیں تو لاکھوں من کے بیٹھے ہیں
ایک کانٹے کی تُلی ایک ہی سانچے کی ڈھلی / یہ بھی کلیاں ہیں کہ دل کے ترے چھالے بلبل
زہر کے سب ہیں بجھے ایک سے ہیں ایک بڑھے / اُنکے ناوک۔ مری آہیں۔ ترے نالے بلبل

غرضکہ انکا سارا کلام زبان و محاورہ کی خوبیوں سے مالامال ہے۔

ریاض کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی اور معاملہ بندی میں بھی بند نہ تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس صنعت میں اپنے اُستاد کی تقلید کرتے ہیں لیکن آزادنگاری میں اُن سے کبھی بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

بیٹھ جاؤں میں اُنھیں چھپا کے یوں حشر کے دن / لوگ دیکھیں تو کہیں وعدہ وفا ہوتا ہے
وقت ہی ایسا تھا رخصت ہوگئی اُنکی حیا / بات ہی ایسی تھی کھُل کھیلے وہ شرمانے کے بعد

ان کی طبیعت کی شوخی نے بعض اشعار کو لباس تہذیب میں نہ رہنے دیا اور ابتذال پیدا کر دیا ؎

کہتا ہے پکارے یہ ترا جوش جوانی / سینے سے لگالے کوئی سینے سے لگالے
جو مجھکو گدگدائے وہ جوبن کا ہے اُبھار / جو تم کو گدگدائے وہ میری نگاہ ہے
کہتے ہو رگ گُل سے سوا تھے لب رقیب / نازک سے گورے گالوں کی رنگت گواہ ہے

جیسا کہ اس کے قبل بیان کیا گیا ریاض معاملات عشق میں معشوق سے دب کے رہنا نہیں چاہتے بلکہ اپنی شوخی سے اُسے رام کر لیتے ہیں لیکن اُن کی شوخی بعض اوقات حدود سے اس قدر تجاوز کر جاتی ہے کہ شعر میں واسوخت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے نمونہ کے طور پر ہم ذیل میں صرف ایک شعر لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں ؎

غیر کی جان کو رونے گئے تھے غیر کے گھر / زلفیں کھولے تو گئے بال سنوارے نکلے

لیکن اس قسم کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے اور نہ یہ خامیاں انکی شہرت و کمال پر حرف لا سکتی ہیں۔ ہر پُرگو شاعر کے کلام میں رطب و یابس اشعار کا ہونا لازمی ہے لیکن اس کی قدر و منزلت کے لیے یہ کافی ہے کہ اسکے محاسن کا پلہ معائب سے زیادہ بھاری ہو اور یہی حال ریاض کی شاعری کا ہے۔

ریاضؔ پُرانے شاعروں کی ایک یادگار تھے۔ اُنکے کلام میں قدیم رنگ جواب شاید کسی میں نہیں پایا جاتا کافی حد تک موجود ہے۔ لکھنؤ کا رنگ ملاحظہ ہو ؎

دلِ مشتاق سے کہتی ہے یہ گھونگھٹ کی نگاہ
پاؤں نکلا نہیں گھر سے کبھی باہر میرا

جو گونج اُلجھی بالے کی جھنجلا کے بولے
لگے پیار کو آگ ابھی کان جاتا

کہاں چلے ہیں حبیبِ پر چنے ہوے افشاں
کہاں وہ حسن کی دولت لٹانے جلتے ہیں

ابتدا ہی سے رعایتِ لفظی ہمارے شعرا کے مرغوبِ طبع رہی ہے بلکہ بعض تو اس صنعت کے عاشق تھے۔ آماناتؔ نے اسی کے پیچھے اپنی شاعری کو ڈبو دیا۔ اس صنعت کی خوبی یہ ہے کہ مناسبت سے الفاظ اس طرح استعمال کیے جائیں کہ تصنع کا شائبہ کبھی نہ پیدا ہو۔ ہر لفظ معنی دیتا ہو اور پڑھنے والے کو اس کا ادراک واحساس نہ ہو۔ ریاضؔ کی شاعری میں اسکے بہترین نمونے ملتے ہیں ؎

حنا دل میں صبا میں چل گئی تھی
اُڑا دی بات پھولوں نے ہنسی میں

سو گیا ہوں دھوپ میں تو میرے جاگے ہیں نصیب
آج مجھ تک سایۂ دیوارِ یار آنے کو ہے

پڑ گئی ہے شام سے مدفن کے پھولوں پر کچھ اوس
ہنسنے والا آج شاید اشکبار آنے کو ہے

لیے بیٹھے رہو اپنے لیے تم آرسی اپنی
خوشامد خور یہ منہ دیکھی ہماری دیکھی بھالی ہے

اسی ضمن میں یہ ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریاضؔ نے اب تک چند قدیم محاوروں کو جاری رکھا اور اُنکو اپنے اشعار میں اس طرح جگہ دی کہ وہ خوشنما معلوم ہوتے ہیں ؎

شمع کھُل کھیلی ہے پروانوں سے آج
کچھ سُنے گی وہ لبِ گلگیر سے

اتنے لیے کہ آؤ بھگت بیکدے میں ہو
پوچھا جو گھر کسی نے تو کعبہ بتا دیا

میں نے اے صیاد بھر پایا قفس میں کیا خوب
مجھے آزاد کریں وہ مجھے آزاد کریں

کہتا ہے پکار کے یہ مرا جوشِ جوانی
سینے سے لگا لے کوئی سینے سے لگا لے

اتنک کے چلتے آدمی کے مارے
آسماں بھی نہیں زمیں بھی نہیں

اب ہم اُنکے کلام سے انتخاب کرکے چند اشعار لکھتے ہیں تاکہ اربابِ سخن اچھی طرح مستفید ہوں

قیامت اور قیامت میں آئی خوب ہوا
بتوں نے چھیڑ دیا سامنے خدا کے مجھے

شوخی سے ہر شگوفہ کے ٹکڑے اُڑا دیے
جس غنچہ پر نگاہ پڑی دل بنا دیا

گل مرقعے ہیں ترے چاک گریبانوں کے
شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے

مقبول دعائیں نہیں ہوتیں نہیں ہوتیں — قسمت میں ترستا ہے ترستے ہیں اثر کو
بیدرد تجھ کو بات کا جب بھی یقیں نہ ہو — ہم رکھدیں سامنے جو کلیجہ نکال کے
سُنکے نالے مرے منہ پھیر کے ہنسنا اُنکا — ہنس کے کہنا کوئی دیوانہ ہے سودائی ہے
چھیڑتے ہیں پا کے موقع اُنکے اُترے ہار بھی — بنتے ہیں کیوں دل ہمارا پھول مرجھانیکے بعد
کوئی ہیرے کی کنی سے کم نہ تھا ہنگامِ ضبط — کچھ ہمیں پینے پڑے آنسو بھی غم کھانیکے بعد
یہ بدلنے کے نہیں لاکھ زمانہ بدلے — مجھ سے بدبخت کا دن غیر سے بدذات کی رات
مجھ سے بے پردہ ملے مل کے کیا گم مجھ کو — ایک اس ساری خدائی میں لے تم مجھ کو

حقیقت یہ ہے کہ ریاض دَورِ قدیم کے ایک قابل عظمت یادگار اور اس عہد میں جہان سخن کی جان تھے ۔ تمام ہندوستان میں ان کی شاعری کی دھوم تھی اور سب انکی سیف زبان کا لوہا مانتے تھے ؎

یادگار اسوقت ہم بھی ہیں زمانہ میں ریاض — مانتے ہیں سب ہمیں ہم مانتے ہیں میر کو
ہندوستاں میں دھوم ہے کس کی زبان کی — وہ کون ہے ریاض کو جو جانتا نہیں

اختتام کلام پر ہم ریاض کے مخصوص رنگ یعنی خمریات سے چند شعر درج کرکے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں ؎

اُٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے کو ہو آئے — پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں
مرگیا ہوں یہ تعلق ہے جو میخانے سے — میرے حصے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے
کس غضب کی ہوا میں مستی ہے — کہیں برسی ہے آسمان سے آج
کاٹے کٹتی نہیں مجھ مست سے برسات کی رات — میکدے والی جو مل جائے تو کچھ کام چلے
توبہ سے ہماری بوتل اچھی — جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

بوتل جام بنی ہو یا نہ بنی ہو لیکہ ٹوٹی ہو یا نہ ٹوٹی ہو، ہمیں ریاض کے لیے افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

ارزاں ایڈیشن کے خریداروں کو ختم میعاد پر وی پی نہیں بھیجا جاتا جب تک وہ وی پی طلب نہ فرمائیں ۔ بلکہ انکی کفایت اور دفتر کو نقصان سے بچانے کے لیے توقع کیجاتی ہے کہ ختم میعاد کی اطلاع پاکر چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں گے ۔

منیجر الناظر لکھنؤ

بدنام ترک

(جناب مولوی خلیل الرحمن صاحب مترجم اخبار الاندلس وغیرہ)

پندرہ سولہ برس ہوے کہ ایک صاحب، مسٹر سٹڈرڈ، امریکی نے دو تین کتابیں مسلمانوں کے متعلق لکھی تھیں۔ ان میں مسلمانوں کی بے حد تعریفیں کی گئی تھیں۔ شاید انسان کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ اپنی تعریفیں سننے سے بہت خوش ہوتا ہے۔ یہ کتابیں بہت شوق سے پڑھی گئیں، اور شاید ایک کا اردو ترجمہ بھی شایع ہوا۔ اہل نظر حضرات اسی وقت سمجھے تھے کہ یہ نظر بندی اس لیے ہے کہ رقیب اصلی حالت سے واقف ہو کر جن کی تعریف کی گئی ہے ان کی تباہی کا فکر کریں۔ چناں چہ اسی وقت سے کانٹے بونے کا نکر شروع ہوا۔ اُن میں سے بعض اس قابل ہو چکے ہیں کہ جسم میں چبھنے لگے ہیں۔ اللہ کریم انکے زہروں سے محفوظ رکھے۔

اب ایک دوسرے امریکی مسٹر ای الگزینڈر پاویل نے ادھر توجہ فرمائی ہے اور ایک کتاب، موسومہ "مسلم ایشیا میں حکومت کی جد وجہد" شائع فرمائی ہے۔ اس کے دیباچے میں ناظرین کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ وہ بدنیت نہیں ہیں۔ ہم مسلمان گرم دودھ سے ایسے جلے ہیں کہ چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتے ہیں: اس واسطے مترجم صرف اتنا ہی کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ "اللہ کرے کہ مسٹر پاویل بدنیت نہ ہوں"۔ ذیل میں اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ درج ہے۔ شاید ناظرین کو، بلا لحاظ ملت و قومیت، پسند آئے اور نئی باتیں معلوم ہوں، اس کتاب کے کُل ۳۱۲ صفحات ہیں اگر کوئی صاحب اس کا ترجمہ کر دیں تو غالباً دلچسپ ہوگا۔ اگر اور کچھ نہیں تو اس ہی وجہ سے کہ اس میں زیادہ تر مسلمانوں کی تعریف کا پہلو نکلتا ہے۔

جو بزرگ کہ اُردو کی رصدگاہوں میں صرف انشاءِ اردو کی مین میکھ نکالنے کے لیے مرتب اور دنیاءِ اُردو کے محسن ہیں اُن کی خدمت میں التماس ہے کہ یہ ترجمہ قریباً تحت اللفظ ہے۔ اس صورت میں انشاء میں خامیاں ہونی مسلّم۔ یہ حضرات مترجم کو

اگر بخشیں زہے رحمت نہ بخشیں تو شکایت کیا

ہم نے تاریخ عالم کے نہایت حیرت ناک اور عجیب وغریب ڈراموں میں سے ایک تماشا اپنی

آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک مختصر سے عرصے میں، جو پانچ برس سے بھی کم کا تھا اور جو ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو مُدرانیا کے عارضی معاہدۂ التوائے جنگ سے شروع ہو کر ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو لوزان کے معاہدے پر دستخط ہونے کے دن ختم ہوتا ہے، ہم نے ایک نئے ٹرکی کو اس طرح اُٹھتے دیکھا، جیسے ایک ضعیف البنیاد حقیر و ذلیل کھنڈر سے زمانۂ حال میں ایک ابوالہول اُٹھ کھڑا ہو۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس جواں عمر قوم (ٹرکی) نے جو اندرونی حکومت موجودہ جمہوری حکومتوں سے بھی زیادہ جمہوری ہے، کامیابی کے ساتھ فتح مند اتحادیوں کا مقابلہ کیا ہے؛ حال آں کہ یہ اتحادی، اطمینان کے ساتھ، یہ یقین کیے بیٹھے تھے کہ ہم نے اُس (عثمانیہ) سلطنت کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ وہ بالکل عاجز و فرماندہ ہو گئی ہے اور اُس میں ہم نے کھڑے ہونے کی طاقت ہی نہیں چھوڑی۔ اسی شکستہ و فرسودہ سلطنت نے اُس معاہدے کے پُرزے کر کے پھینک دیے جس کو تسلیم کر لینے کے لیے اتحادی اُسے مجبور کر رہے تھے۔ اُس مقہور سلطنت نے یونانیوں کی اُس فوج کو نیست و نابود کر دیا، جو اُس کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ اُس نے برطانیۂ عظمیٰ، فرانس، اٹلی اور یونان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی اُن چالوں پر جو وہ ایشیائے کوچک میں اپنے حدود کے اضافے کے لیے چل رہے تھے "تمت تمام شد" لکھ دیں۔ اُس نے یوروپ کے کابینوں کو توڑنے اور یوروپ کے ایک بادشاہ سے تاج و تخت چھوڑانے میں کامیابی حاصل کی؛ ایک لائق ترین سیاست داں کو، جو کونسل کی میز پر بیٹھا حکم رانی کر رہا تھا، نیچا دکھلایا۔ اُس نے اپنے فوجی اقتدار میں وہ تفوق حاصل کیا جو سلطنت عثمانیہ میں کسی سلطان نے پچھلے ڈھائی سو برس میں نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے حکومت اور دین کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا، اور اس پر لطف یہ ہے کہ پھر بھی دُنیا، اسلام کا وہ غیر متنازعہ راہ بر و راہ نما بنا رہا۔ ہماری آنکھوں نے اُن سلاطین کے آخری جانشین کو معزول ہوتے دیکھا ہے، جو چھ سو برس سے ترکوں پر بہت بُری طرح حکومت کرتے آ رہے تھے۔ ہم نے ترکوں کے دارالسلطنت کو باسفورس کے کنارے سے اندرون ایشیا کے ایک غیر معروف مقام پر منتقل ہوتے دیکھا ہے؛ حال آں کہ مقدم الاسم وہ مقام تھا، جو بازنطینیوں کے انتزاع کے بعد سے اُن کا مستقر چلا آتا تھا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جن ہارے ہوئے اور ناکارہ ترکوں کے متعلق یہ یقینی خیال تھا کہ وہ یوروپ سے لات مار کر نکال دیے جائیں گے، اُنھوں نے یہ کر دکھایا کہ اپنی حدود سلطنت کو اُس مقام سے بھی اور آگے بڑھا لے گئے جہاں وہ جنگ عظیم سے پہلے تھے۔ ہماری آنکھوں نے دیکھ لیا کہ اُن کے متعلق جتنی پیشین گوئیاں تھیں اُن کے برخلاف پیش آیا۔ میں اوراق مابعد میں ایک قوم کے از سر نو اقتدار حاصل کر لینے کی وہ داستان بیان

کرنا چاہتا ہوں، جو نہ صرف حیرت انگیز ہے، بلکہ قسمت کی ایسی نیرنگی کا قصہ ہے جس پر اگر ہم خود نہ دیکھ لیتے تو اعتبار آنا مشکل تھا۔ تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ یہ اولوالعزمی و بلند نظری، بدظنی و شکوک، رشک و حسد اور سازشوں کی ایک وا شگاف حکایت ہے، جس نے یہ صورت ممکن کرکے دکھلا دی۔

امر واقعہ یہ ہے کہ امریکہ کے لوگوں کو غلط خبریں دی گئیں، اور ان کو اس دَعائیہ[1] نے بالکل اندھا کر دیا، جو ترکوں کے برخلاف کیا گیا؛ اخباروں کے کالموں اور گرجاؤں کے منبروں نے اُن کے خلاف ایسی کارروائیاں کیں کہ بیاکانہ جھوٹ اور دروغ بافی میں اُن کی مثال شاید نہ ملے یا بہت ہی کم ملے۔ یہ دَعائیہ ایسی عیاری، مکاری، دغابازی، مگر باقاعدگی سے کیا گیا اور داعیوں نے ایسی ہوشیاری کے ساتھ ہماری قوم اور ہمارے مذہب کے تعصبات سے کام لیا کہ ہم نے اس کی ظاہری صورت پر اعتماد کر لیا اور ہمیں اس کا یقین آ گیا کہ تُرک کی صحیح تصویر ویسی ہی ہے جیسی کہ اُسکے دشمنوں نے کھینچی ہے۔ ترکوں کے خصائل کا ہمیں صرف سماعی علم تھا؛ کیوں کہ امریکہ میں فی الحقیقت کوئی تُرک ایسا نہیں ملتا جو اپنا حال خود بیان کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب لفظ "تُرک" ہمارے سامنے بولا جاتا تھا تو ہمارے روبرو ایسی ہستی آ جاتی تھی، جو عداوت و فساد، تعصب و غیر رواداری اور شک و شبہہ کا ایک مجسمہ ہوتی تھی۔ ہمارے ذہن میں وہ حکایت بھیل کے گنڈوں کی بات آ جاتی تھی کہ "یار دیکھو تو! وہ اجنبی آ رہا ہے؛ اس کے ایک لات تو لگے"!

مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ امریکہ والے ترک اور ٹرکی کے متعلق صحیح بات سنیں۔ وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ آنکھیں کھول کر صحیح طور سے واقعات پر نگاہ ڈالیں اور اس عجیب و غریب بڑے جزیرہ نما کے اندرونی اور واقعی حالات معلوم کریں، جو بحر اسود کو بحر روم سے جدا کرتا ہے۔ وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ ترکوں کی حالت اُس عینک سے دیکھیں، جس پر نا واقفیت، تعصب یا غلط فہمی نے اپنا رنگ نہیں چڑھا دیا ہے۔ یہ نہایت موزوں وقت ہے کہ وہ اتحادیوں کے اُن

---

[1] پروپے گنڈا ایسا لفظ ہے کہ اس کے لکھنے میں کوفت اور پڑھنے میں زبان کو سکتہ ہوتا ہے؛ اس کی مکروہ صورت کو تو کون کہے۔ مسلمانوں کے یہاں یہی چیز کئی بار اسی کیفیت کے ساتھ ہو چکی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ۔ انھوں نے اس کو دعوۃ یا دعوے کہا ہے؛ مثلاً دعوے عباسیہ، جس نے کامیابی کے ساتھ عربی سلطنت بنو امیہ کی جڑیں اکھاڑ دیں؛ دعوت اسمٰعیلیہ، جس نے عارضی کامیابی حاصل کی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے حیدرآباد کے لفظ دعائیہ کو پروپے گنڈا کا مترادف استعمال کیا ہے۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو امیدوار اصلاح ہوں (مترجم)

سیاست دانوں کی پالیسیوں کو غور سے دیکھیں، سمجھیں اور جانچیں جو مشرق قریبہ کے سوالات کا بیکار ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر دنیا کے امن و امان میں خلل ڈال رہے ہیں۔

ترکوں کے متعلق ان ابواب کے لکھنے میں اُن لوگوں کو میں مخاطب نہیں کرتا جو گلیڈسٹون کی پرانی روایات سے ایک ہی طرف کو مائل ہو گئے ہیں اور اس کا یقین رکھتے ہیں کہ ان زنانوں (ترکوں کو اُنھوں نے یہی خطاب دے رکھا ہے) کو نہ صرف یورپ سے بلکہ دنیا بھر سے نکال باہر کرنا چاہیے۔ میں اُن لوگوں کو سمجھانے کی کوشش نہیں کرتا، جو تعصب کے رنگ میں اتنے شرابور ہیں کہ وہ ترک کی بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ اور جن کے دل اتنے سخت ہو گئے ہیں کہ وہ یقین کیے بیٹھے ہیں کہ "امریکہ کا پرانا باشندہ صرف وہی اچھا تھا جو مر چکا ہے۔" میرا روئے سخن اُن معقول پسند اور فراخ دل لوگوں کی طرف ہے جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ ترکوں کی حالت کے متعلق صحیح و بے لوث بات سننا چاہتے ہیں، خواہ وہ کیسی ہی ناگوار کیوں نہ ہو اور خواہ اُن کو اپنی رائیں ہی کیوں نہ بدلنا پڑ جائیں۔

لیکن قبل اس کے کہ آگے بڑھوں، میں بالکل صاف طور پر یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے پاس ترکوں کی طرف سے کوئی وکالت نامہ نہیں ہے۔ میں ترکوں کا ہرگز طرف دار نہیں ہوں؛ نہ کوئی شخص مجھ پر یہ الزام لگا سکتا ہے کہ میں یونانیوں، ارمنیوں یا انگریزوں کا معاند ہوں۔ میں یہ ابواب صرف اس لیے نہیں لکھ رہا ہوں کہ ترکوں کی طرف سے معذرت خواہ ہوں۔ یا ان کو الزامات سے بری کرانا چاہتا ہوں، بلکہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اب تک وہ رائے عامہ کے سامنے بالکل گونگا بہرا بنا ہوا کھڑا ہوا ہے۔ اُس کی طرف سے کوئی بولنے والا بھی نہیں۔ یہ صورت ایسی ہے کہ امریکہ کے طرز عدل و انصاف سے بالکل بعید ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص مجرم ہو، مگر مہذب برادری میں یہ دستور ہے کہ سزا دینے سے پہلے اُس کا بیان بھی سُن لیتے ہیں۔

ترکوں کی طرف سے بیان دیتے وقت میں اپنے آپ کو اُس حالت میں پاتا ہوں جس میں میرا ایک نہایت لایق وکیل تھا۔ ہم دونوں اٹھارویں دفعہ اور اُس کی ترمیم پر بحث کر رہے تھے۔ وہ کہنے لگا کہ: "اگرچہ میں خود شراب کو کبھی چھوتا نہیں، مگر اُس کی ممانعت میں جو قانون بنا ہے اُس کو میں پسند نہیں کرتا۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ اصولاً غلط ہے۔ باوجود اس کے میں یہ بات علی رؤس الاشہاد بھی نہیں کہنا چاہتا جیسے کہ وہ مشہور و معروف اور ایمان دار آدمی نہیں کہہ سکتے جو اس قانون کے خلاف رائے رکھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر میں ایسا کروں تو گویا میں اُن متقیوں اور

بڑی منظم جماعت اور صاحب اثر لوگوں کے مقابلہ میں کھڑا ہوتا ہوں جو یہ ظاہر کریں گے کہ شراب کی ممانعت کے خلاف کہنے کی وجہ سے میں ایک گناہ میں شامل ہو رہا ہوں"۔

اگر ترکوں کے متعلق سوالات پر صاف صاف طور سے بحث کی جاوے تو بعینہٖ یہی بات صادق آتی ہے۔ میں اپنی حیثیت کو اس معاملے میں صاف کرنے سے اسی لیے مایوس سا ہوں۔ میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ امریکہ کی پبلک کا ایک بڑا قوی اور معزز گروہ ایسا ہے (جس میں زیادہ تر مذہبی لوگ شامل ہیں) جو ترکوں کے سخت خلاف ہے اور یہ نیک نہاد لوگ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے کہ اگر ممکن ہو تو ترکوں کو اقوام دنیا کی برادری سے خارج کر دیا جاوے میں اس سے بھی واقف ہوں کہ اگر میں اُن کے سامنے ترکوں کے متعلق اپنا مقصود اصلی ظاہر کروں تو وہ اُسکو دوسرے معنوں پر محمول کریں گے اور مجھ پر یہ الزام لگائیں گے کہ میں اُن کے قتل عام کرانے اور اُن کی بدعملی کی حمایت کر رہا ہوں۔ میں ترکوں کی خوفناک بے رحمی اور ظلم کے معاملے میں جس نے اتنے عرصے تک ترکوں کی حکومت کو بدنام کیے رکھا، اُن کو ملامت کرنے میں کسی سے دبنے والا نہیں ہوں؛ مگر یہ کہنا بھی بالکل سطحی ہے کہ ترکوں نے ارمینیوں کا قتل عام کیا، اُنھوں نے اپنی رعایا پر ابتری کے ساتھ حکومت کی، وہ نہ کبھی اچھے رہے' نہ اچھے رہیں گے۔ میں اتنا ہی کہہ کر اس معاملے کو یہیں چھوڑ دوں گا۔ باوجود اس کے کہ مجھے یہ خطرہ ہے کہ میں جو کچھ کہوں گا اُس کو توڑ مروڑ کر یہ کہا جاوے گا کہ میں ترکوں کے جرائم کو کم کر کے دکھلا رہا ہوں، میں یہ چاہتا ہوں کہ اوراق مابعد میں اپنی قابلیت کے موافق ٹرکی کے متعلق جو پیچیدہ سوال ہے اُس کو بغیر کسی کی حمایت کیے کھول کر دکھلا دوں۔

امریکہ والوں کے دلوں میں ترکوں کی دشمنی گہری بیٹھی ہوئی ہے، جس کے کئی وجوہ ہیں۔ کوئی شبہہ نہیں کہ ان میں سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ زمانۂ گزشتہ میں اُنھوں نے اپنی عیسائی رعایا کے ساتھ بڑا بے رحمانہ سلوک کیا، خاص کر ارمنیوں کے ساتھ؛ دوسری وجہ یہ ہے کہ اُن سے دینی تعصب ہے اور اُن کے خلاف سیاسی دعایہ کیا گیا ہے۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلا سبب کہاں ختم ہوتا ہے اور دوسرا کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ہم کو اس معاملے میں ناکامی ہوئی اور اس سے چڑ گئے ہیں کہ وہ قوم جس کو ہم شکست خوردہ اور تباہ شدہ فرض کیے ہوئے تھے وہ پھر واپس آ گئی؛ آخری وجہ یہ ہے کہ ترک اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے الزامات کی جواب دہی نہیں کریں گے۔

انھوں نے ارمینوں کے ساتھ جو سلوک کیا اُس کا جواب تو دیا جا سکتا ہے (جس کے لیے میں آگے چل کر ایک مستقل باب محفوظ کرتا ہوں) مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ اُن پر سے یہ الزام بالکل ہی اُٹھ جائے۔ مانا کہ ارمنی بڑے غیر ہر دل عزیز ہیں اور اس قابل نہیں ہیں کہ کوئی اُن کو پسند کرے، وہ اپنی حرکات سے اوروں کو غصہ دلاتے ہیں مگر ترکوں نے اُن کے ساتھ جو کچھ بھی کیا، اس کی وجہ سے ہر سمجھ دار آدمی کو ترکوں پر لعنت ملامت کرنی چاہیے۔

ترکوں کے خلاف جو سیاسی دعائیہ ہو رہا ہے وہ سالہا سال سے چلا آتا ہے؛ اور گو بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے خلاف جو کچھ کہا جاتا ہے وہ صحیح ٹھیرتا ہے؛ مثلاً اُن کی لغاریہ میں بے رحمیاں جن کی بناء پر اُن کے خلاف گلیڈسٹون کا مقولہ مشہور ہے۔ لیکن یوروپین اقوام نے اس دعائیہ سے اپنی سیاسیات اور اپنی حدود مملکت بڑھانے میں کام لیا۔ جب ۱۹۰۸ء میں آسٹریا ہنگری نے بوسینا اور ہرزیگوینا کو اپنی سلطنت میں ضم کیا ہے تو ترکوں کے خلاف دعائیہ سے یوروپ بھر میں ایک غلغلہ ڈال دیا تھا۔ پہلی بلقان کی جنگ کے موقعہ پر لغاریہ، سرویہ، مانٹی نگرو اور یونان نے اس دعائیہ سے کام لیا؛ اور جنگ بلقان سے پہلے اس کو انھوں نے اس غرض سے استعمال کیا کہ جو بربریت و خوں خواری اُن کے اپنے کاہشاجیوں نے ترکی رعایاء مقدونیہ کے ساتھ کیں اُن کی طرف دنیا کا خیال نہ جانے پائے۔ اٹلی نے اس سے اُس وقت کام لیا جب اُس نے زمانۂ حال کی تاریخ میں سب سے بڑی ناجائز اور غیر منصفانہ لڑائی طرابلس سے اس پر قبضہ پانے کے لیے چھیڑی۔ جنگ عظیم کے پورے چار برسوں میں اتحادیوں نے ترکوں کے خلاف دعائیہ بطور ایک جائز ہتھیار کے بالکل اُسی طرح جاری رکھا جیسے جرمنی کے خلاف۔ انگلستان اور یونان اُس سے جنگ عظیم سے لے کر اُس وقت تک برابر کام لے رہے ہیں۔ یہ جاری و ساری گولہ باری ایسی ہے جس کے گولہ بارود کے اجزاء مساوی الوزن سچ، آدھے جھوٹ اور بالکل جھوٹ پر مشتمل ہیں اور اس کے جواب دینے کا کوئی موقعہ ترکوں کو نہیں ملا۔ اس کے دو وجوہ ہیں: اول یہ کہ مغربی یوروپ اور امریکہ میں ترکوں کی طرف سے بولنے والے آدمی بہت کم تھے؛ دوسرے یہ کہ مغربی یوروپ اور امریکہ کی تاربرقیاں اور اخباروں کے کالم ضرورتاً اُن کے لیے بند تھے۔ جہاں تک کہ اپنے مقدمے کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا سوال تھا ترکوں کی زبانیں بالکل بند کر دی گئی تھیں، اور اب تک بند چلی آتی ہیں۔

کچھ عجب نہیں کہ اہل امریکہ اس بات سے پوری طرح واقف نہیں ہیں کہ مشرق قریب کے متعلق جو دسیسے التواء جنگ کے چار برس بعد تک امریکہ کے اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں اُن کے دس

حصوں میں سے نو حصے ایسے ہوتے تھے جو ترکوں کے دشمنوں کے ذرائع سے آتے تھے۔ اس عرصے میں قسطنطنیہ برطانیہ کے زیر تسلط تھا، سمرنا پر یونانیوں کا قبضہ تھا اور انگورہ (انقرہ) کا تعلق بیرونی دنیا سے اس طرح منقطع تھا گویا وہ مریخ کے ستارے میں واقع ہے۔ کیا اہالی امریکہ اتنے بھولے بالے ہیں کہ وہ یہ خیال کر لیں گے کہ جو خبریں ترکوں کے موافق ہوتی ہوں اُن کو قسطنطنیہ اور سمرنا کے محتسبین (سنسر) انگلستان و یونان، بغیر قطع و برید، امریکہ میں آنے دیتے ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔ اس کے علاوہ اس امر واقع کو بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ خبروں کے جتنے تار یوروپین نامہ نگار امریکہ کے اخباروں کو بھیجتے تھے اُن میں سے ۹۰ فی صدی وہ ہوتے تھے جو لنڈن کے راستے سے آتے تھے۔ یہ ہرگز نہیں سمجھ بیٹھنا چاہیے کہ برطانیہ میں تاروں کے سنسر کرنے والا عملہ جنگ کے بعد موقوف کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ترکوں کی تار برقیوں کے ذرائع رسل و رسائل برطانیہ اور اُس کے حلیف یونانیوں کے قبضے میں تھے، اس وجہ سے اُن کو یہ موقعہ حاصل تھا کہ جن خبروں کو چاہتے اُن کی قلب ماہیت کر کے امریکہ کے رہنے والوں کے سامنے پیش کرتے یا اُنکے بھیجنے میں دیر کرتے، یا بالکل دبا ہی بیٹھتے اور ایسی خبریں بھیجتے جو ترکوں کے موافقت میں نہیں ہوتی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اس ملک میں پہنچتے پہنچتے تو پرانی ہو چکی تھیں۔ وہ اگر چھپتی بھی تھیں تو اُن کو اخبارات کے سب سے آخری صفحات میں چھاپا جاتا تھا؛ یوں اُن کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ یہ یک طرفہ "نئی خبریں" ہوتی تھیں جن پر امریکہ کے رہنے والے ترکوں کے متعلق اپنی رائیں قائم کرتے تھے۔

اتحادیوں نے جو یہ عزم مصمم کر رکھا تھا کہ دنیا کے سامنے کوئی ایسی بات نہ آنے دیں گے جس کا نتیجہ ترکوں سے ہمدردی ہو۔ اس کی ایک مخصوص مثال یہ ہے کہ جو بین الاقوامی کمیشن اس لیے قائم کر کے سمرنا بھیجی گئی تھی (اور جس میں امریکہ کا جنرل سمرول بھی شامل تھا) کہ وہ اُن بے رحمیوں کی تحقیقات کرے جو یونانیوں نے ۱۹۱۹ء میں سمرنا میں اُس موقعے پر کی تھیں کہ جب انھوں نے اُس شہر پر قبضہ کیا تھا، اُس کمیشن کی رپورٹ دبا لی گئی (اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی گئی) اس کے مقابلے میں اتحادیوں نے اُن زیادتیوں کا حال ساری دنیا میں پھیلا دیا جو ترکوں سے وقوع میں آ ئی تھیں۔ انھوں نے دنیا کو اُن خوں ریزیوں کی خبروں کے دینے سے قطعی انکار کر دیا، جو عیسائیوں نے ترکوں پر کی تھیں۔

ترکوں کے خصائل، اُن کے نصب العین، اُن کے مسائل حاضرہ اور اُن کے مستقبل کے متعلق تخمینہ لگانے میں اہالی امریکہ کو اُن راؤں اور پیش گوئیوں پر بہت زیادہ اعتبار کرنا

پڑتا ہی جو آرام کرسی پر بیٹھنے والے مبصروں اور ناقابل اعتبار ماہروں نے ظاہر کی تھیں۔ ان لوگوں کو ترکوں کے ملک یا ٹرکی کے لوگوں کے متعلق کوئی براہ راست اطلاع نہیں ہی۔ ایسے ہی لوگ ترکوں پر خامہ فرسائی فرماتے ہیں۔ آج کل کے مشرق قریبہ کے سوال پر دو کتابیں ایسی ہیں کہ سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہیں اور اُن کے اقتباسات لیے جاتے ہیں۔ ان کا مصنف ایک ایسا شخص ہی جو اگرچہ مشرق قریبہ کے معاملات کا غائر مطالعہ کرنے والا آدمی ہی، مگر اُس نے ترکوں کے حدود اراضی کو کبھی اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ امریکہ کے اخباروں میں جو ترکوں کے معاملات پر اڈیٹوریل لکھنے والے ہیں اُن میں ۹۹ فی صدی ایسے لوگ ہیں جنھوں نے کبھی ٹرکی کی صورت نہیں دیکھی اور میں شرط لگاتا ہوں کہ ان کا ایک بھی صورت آشنا عثمانی ترکوں میں نہیں ہے۔ امریکہ کے وہ نامہ نگار جنھوں نے لوزان اور دوسرے مقامات میں صلح کی کانفرنسوں میں کام کیا ہی مقابلۃً بہت ہی کم ایسے ہوں گے جن کو ٹرکی اور ترکوں کے متعلق کوئی براہ راست علم ہو؛ اگر انھوں نے کچھ روا روی میں معلومات حاصل کی ہیں۔ صرف اُن چند ہفتوں میں جب وہ قسطنطنیہ میں مقیم تھے، یا سمرنا اور انگورہ میں کھڑے کھڑے گئے تھے بھلا ایسے مصنفین، خواہ وہ کیسے ہی مخلص اور دل سوز ہوں، کسی مستند طریقے سے اُن لوگوں کے دلی منشا اور ارادوں پر بحث کرسکتے ہیں جو ایسے دشوار گزار مقامات میں رہتے ہوں جیسے اناطولیہ، آرمینیہ، کردستان، سلیشیا اور عراق ہیں؟ باوجود اس کے ایسے ہی لوگوں کی تحریرات کی بنا پر جن کو خود ہی بہت کم علم ہی، اہالی امریکہ اُن مسائل کے متعلق اپنا فیصلہ صادر فرماتے ہیں جو شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ پیچیدہ ہیں اور جن میں بہت غلط فہمیاں ہوچکی ہیں۔

ایک مرتبہ ایک اخبار نویس نے سر اڈورن پیرس سے جو اپنے زمانے میں یوروپ کے مسائل کا سب سے بڑا ماہر تھا، یہ سوال کیا کہ "مجھے ترکوں کے متعلق جو مسائل ہیں اُن کو سمجھنے میں کتنی دیر لگے گی؟" سر اڈورن نے اُس کو یہ خشک جواب دیا کہ "حقیقت یہ ہی کہ میں ٹھیک نہیں بتا سکتا: میں ٹرکی میں صرف چالیس برس رہا ہوں۔"

امریکیوں کو جو ٹرکی کے متعلق بدگمانیاں ہیں وہ مشنریوں کی وجہ سے ہیں۔ میں جو یہ کہہ رہا ہوں اُس سے میرا مقصود اُن لوگوں کی تنقیص نہیں ہی۔ امریکہ کے مشنریوں نے جو کوششیں پرانی عثمانی سلطنت میں کی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں، مگر اہالی امریکہ کی رایوں پر جو اس کا اثر پڑا وہ غالباً کم لوگوں کو معلوم ہی۔ امریکہ کے مشنریوں نے جب وہاں کام شروع کیا ہی تو ان کو شروع ہی

میں معلوم ہو گیا تھا کہ مسلمان اپنا دین نہیں بدلتے۔ جب وہ ترکوں کو عیسائی بنانے میں ناکام رہے تو اُنھوں نے اپنی تمام تر قوتیں عیسائیوں کی دینی، تعلیمی اور طبی معاملات کی طرف مرکوز کر دیں خاص کر ارمنیوں کی طرف۔ نصف صدی، بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے تک یہ مشنری مشرق قریب و متوسطہ کے متعلق ذریعہ خبر رسانی رہے اور امریکہ نے اپنی آراء کو ان ہی کی دی ہوئی خبروں کے مطابق ڈھالا۔ جب ترکوں نے ان لوگوں کی مزاحمت کی تو عیسائی ارمنیوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس صورت میں یہ بات بمشکل تعجب خیز ہو گی کہ اُنھوں نے موخر الذکر لوگوں کی حمایت کی۔ اور جو رپورٹیں اور اطلاعیں اُنھوں نے وطن (امریکہ) کو بھیجیں، اور جب رخصت لیکر امریکہ آئے تو جو تقریریں اُنھوں نے کیں وہ سب مظلوم عیسائیوں کی طرف سے گویا جواب دہی کے لیے تھیں اور اُن میں ترک ظالموں کو پیٹ بھر کر بُرا بھلا کہا۔ حاضرین میں وہ لوگ تھے جو مشنریوں کی پرورش کرتے تھے، اُنھوں نے بغیر چون و چرا کے اُن ہی کی رائے کو صحیح مان لیا۔ اس طریقے سے ہمارے گرجاؤں اور کلیساؤں میں ترکوں کے خلاف بڑی قوی رائیں پیدا ہوئیں اور بڑھیں۔

جب جنگ ختم ہوئی تو یہی مشنری اور ان کے رفقاء کار وہ لوگ تھے جنھوں نے وہ قابل الذکر چیز پیدا کی جو بعد کو "مشرق قریبہ کی امدادی کمیٹی" کہلائی۔ اس نے جو کام کیا اُس کی نسبت مختصراً صرف اتنا کہتا ہوں کہ اُس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن اس کمیٹی کے اکثر، بیشتر کارکن مشنری تھے، یا وہ لوگ تھے جو اُن کے زیر اثر کام کر رہے تھے۔ اس کمیٹی کے اثرات امریکہ کے گھر گھر میں پہنچے ہوئے تھے۔ جیسی کہ امید کی جا سکتی ہے سب کے سب ترکی عیسائیوں کے حامی بن گئے۔ اس خصوص میں اتنا کہہ دینا بعید از انصاف نہ ہوگا کہ اس کمیٹی نے محتاج مسلمانوں کو مدد دینے میں بھی اُتنی ہی محنت کی جتنی عیسائیوں کو۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کمیٹی نے سیاسی تحریکات میں بھی اپنا پیر پھنسایا تھا۔ گو ہر شخص جانتا تھا کہ اُس کی ہمدردی کس کے ساتھ ہے — لیکن دانستہ، یا نادانستہ یہ ترکوں کے خلاف داعیہ بن گیا؛ وجہ یہ تھی کہ مشنری کارکنوں نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ایک آزاد اور قوی ترکی سلطنت کے قیام کے یہ معنی تھے کہ ترکی میں جو اُن کے اثرات تھے وہ بہت کچھ زائل ہو جائیں گے اور بہت سی رعایتیں جو اُن کو جنگ کے پہلے سے ملی ہوئی تھیں چھن جائیں گی۔

مسٹر ولیم ٹی ایلس مشرقی معاملات پر ایک مستند آدمی ہیں۔ اُنھوں نے "سیٹرڈے پوسٹ" میں لکھا تھا کہ:—

"معلوم ہوتا ہی کہ ہمارے ہم وطنوں کا اب بھی یہ خیال ہی کہ اب بھی جہاں کہیں ترک اور عیسائی ملتے ہیں، وہاں خوں ریزیاں ہوتی ہیں، حالانکہ جب سے کہ پس پا ہونے والی یونانیوں کی فوج نے ترکوں کے گانوں لوٹے اور جلادیے اور وہاں کے باشندوں پر دست درازی کی اور اُن کو قتل کیا اور اس کا انتقام ترکوں نے سمرنا میں لیا، اُس وقت کے بعد سے خوں ریزی نہیں ہوئی۔ مغربی تھریس سے یہ رپورٹیں آرہی ہیں کہ یونانیوں نے مسلمانوں کو قتل کیا ہی، لیکن ایشیا ئے کوچک میں جو قتل عام ہوچکا ہی اُس کے مقابلے میں یہ بہت چھوٹی چیز ہی۔ خوں ریزی کے قصوں میں مبالغے سے کام لیا گیا ہی؛ اب سے چند روز پہلے قتل عام کے بعض حادثات کا جو ذکر کیا گیا ہی وہ بالکل غلط ہی۔ متذکرۂ بالا امدادی کمیٹی کے ایک مقامی (قسطنطنیہ) رکن نے جس کا تعلق اخباروں سے تھا، اپنے ایک دوست سے صاف صاف کہا کہ وہ امریکہ کو ترکوں کے خلاف اس لیے رپوٹیں بھیجتا رہا کہ اس سے اُس کو روپیہ وصول ہوتا تھا!"

باشندگان امریکہ کے کانوں تک اصلی اور سچی بات پہنچانے میں ترکی کو ایک رکاوٹ بھی رہی ہی کہ امریکہ میں جو ترک رہتے ہیں اُن کی تعداد بالکل بے حقیقت ہی۔ امریکہ میں جو یونانی اور ارمنی رہتے ہیں اُن میں اور ترکوں میں کم ازکم ایک اور تین کی نسبت ہی۔ نتیجہ یہ ہی کہ امریکہ والوں کو اتفاقاً کہیں کوئی ترک نظر پڑ جاتا ہی اور یونانی اور ارمنی انھیں اکثر ملتے رہتے ہیں۔ جب کبھی اور جہاں کہیں کوئی امریکی جوتوں پر روغن کرنے والے، یا میوہ فروش سے، یا ارمنی قالین فروش سے کہیں مل جاتا اور اُن سے باتیں کرنے لگتا ہی تو دس میں سے نو دفعہ وہ اس موقعے کو ترکوں کو بدنام کرنے کا بہت اچھا ذریعہ بنالیتے ہیں۔ جو حملے وہ کرتے ہیں وہ شاید ایک شخص پر نہ کرتے ہوں گے، لیکن بے خبر امریکیوں پر اس کا جو مجموعی اثر ہوتا ہی وہ بہت زیادہ ہی۔ اُس چمکدار آنکھوں والے یونانی نے، جو گلی کے آخر میں جوتوں کو چمکانے کی دوکان رکھے ہوئے ہی، یقیناً آپ کو یہ بتلایا ہی۔ اور بڑی تفصیل سے بتایا ہی کہ جب مصطفےٰ کمال کی فوج ماہ ستمبر ۱۹۲۲ء میں سمرنا میں داخل ہوئی ہی تو اُس نے اُس کے رشتہ داروں کے ساتھ کیا کیا (ظلم) کیا ہی۔ لیکن کوئی ترک ایسا نہیں ملتا جو آپ کو یہ بتلائے کہ چند ماہ پیشتر جب کانسٹین ٹن کی فوج اناطولیہ سے پس پا ہوئی ہی تو اُس نے اُس کے رشتہ داروں کے ساتھ کیا کیا کیا ہی۔ اسی سے آپ سمجھ لیجیے کہ آپ تصویر کا صرف ایک رخ دیکھ رہے ہیں۔

ہم کو جو ترکوں کے بہت ہی کم حالات معلوم ہیں اُس میں بھی ترکوں ہی کا قصور ہی؛ اور وہ یہ ہی کہ وہ اپنا معاملہ دنیا کے سامنے نہیں رکھتے۔ اس کی یہ وجہ نہیں ہی کہ ان کے راہ نماؤں کو چالاکی

کے ساتھ دعائیوں کو پیش کرنے کے بہت بڑے مفید اثرات معلوم نہیں ہیں، یا یہ کہ وہ ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے؛ بلکہ وجہ یہ ہے کہ اول تو ان کو تشہیر جیسے بڑے اور اہم کام کی مہم کو اپنے ہاتھ میں لینے کی سکت نہیں (ترکوں کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ غیر ممالک میں خبر رسانی کے محکمے قائم کریں، مصنفین اور لکچراروں کو مالی مدد دیں، تصویریں شایع کریں اور بذریعہ سنیما اپنی شہرت پھیلا دیں) دوسرے یہ کہ اُن کو یقین کامل ہے کہ اُن کے خلاف ممالک غیر میں جو تعصبات ہیں وہ ایسے ہیں کہ شہرت کی یہ صورتیں بالکل بے کار رہیں گی۔ مجھے سنہ ۱۹۲۲ء کے موسم گرما میں سلطان محمد ششم کی خدمت میں یلدیز کوشک کے اندر باریابی کا موقع ملا؛ میں نے یہ مشورہ دیا کہ اگر ترکوں کے خلاف غلط بیانیاں ہوتی ہیں اور اُن کے متعلق غلط فہمیاں ہیں تو اس کا علاج خود اُن ہی کے ہاتھ میں ہے۔ سلطان نے جواب دیا کہ:

"کیا فائدہ ہے؟ اگر ہم ترکوں کے لکھے ہوئے مضامین بھیجیں تو تمھارے اخبار اور رسالے اُن کو شایع نہ کریں گے، اور اگر شایع ہو بھی گئے تو تمھارے یہاں کے عوام الناس نہ پڑھیں گے اور اگر پڑھ بھی لیں تو اُن کا اعتبار نہ کریں گے۔ اگر ہم کسی طرح اپنے ایسے آدمی امریکہ بھیج بھی دیں، جو امریکہ والوں سے خود اُن ہی کی زبان میں ترکوں کا نقطۂ نظر بیان کر سکیں، تو کیا وہ اُس کو غیر جانب دار ہو کر سُن لیں گے؟"

اب میں صورتِ معاملہ کو خوب اچھی طرح سمجھ سکتا اور عوام الناس کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو بہ نظر امعان دیکھ سکتا ہوں؛ کیوں کہ آخر امریکہ کے عوام کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ یہ معلوم کر سکیں کہ اُن لوگوں کو باقاعدہ طور سے دھوکا دیا گیا ہے؛ لیکن میں اُن اخبارات کے لیے کوئی وجہ معافی نہیں پاتا، جو ترکوں کو بدنام کرنے کی پالیسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں اور اُن کے کالموں میں ترکوں کے خلاف جو الزامات تراشے گئے ہیں اُن کے دفعیہ کی کوئی ترکیب نہیں کرتے، حال آں کہ منصف مزاج لوگوں کو بالکل تسلی ہے کہ یہ الزامات غیر منصفانہ اور ناجائز ہیں۔ مثال کے طور پر سمرنا میں ستمبر سنہ ۱۹۲۲ء میں آگ لگنے کا واقعہ ہے۔ امریکہ کا شاید ایک بھی بڑا اخبار ایسا نہ ہوگا جس نے اپنے ایڈیٹوریل مضامین میں اس زیادتی کا الزام ترکوں کے سر نہیں لگایا۔ اُنھوں نے اس کا بھی انتظار نہیں کیا کہ ترکوں کا بھی جواب سُن لیں۔ آخر فرانسیسیوں کی ایک کمیشن اس واقعے کی تحقیقات کے لیے قائم ہوئی اس میں امریکیوں، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنا مشاہدہ بتلایا کہ یونانیوں اور ارمنیوں نے

اس شہر کو اس لیے آگ لگادی تھی کہ وہ ترکوں کے ہاتھ میں نہ پڑ جائے۔ کتنے اخبار ایسے تھے جنھوں نے ہمت کرکے یہ مان لیا ہو کہ ترکوں کے ساتھ سخت بے انصافی کی گئی ہے؟ پھر رعایا کے تبادلے پر ایک شور و شغب برپا ہوا۔ بجائے اس کے کہ اس واقعہ کو ترکوں کی بربریت کی مثال بنا کر پیش کیا گیا، ہمارے اخباروں نے یہ کیوں نہ لکھا کہ یہ طریقہ ترکوں کی ایجاد نہیں ہے، بلکہ لیگ آف نیشنز کا پیدا کردہ ہے؟ خدا ہی جانتا ہے کہ ترکوں پر کتنے الزامات لگ چکے ہیں جن کے جوابات انھیں دینے ہیں؛ پھر ایسے الزامات اُن پر کیوں لگائے جا رہے ہیں جن کے وہ ملزم نہیں ہیں؟

اناطولیہ میں یونانیوں نے جو شور و شر پیدا کیا تھا اُس وقت امریکہ کے اخباروں کے لہجے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مشرق قریبہ کے مسائل کو مطلق نہیں سمجھتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم، یا اتحادی اس قابل ہی نہیں رہے ہیں کہ درمیان میں پڑ کر اپنا اثر ڈالیں۔ ایک زیرک اور خوددار سیاسی مدبر کا اور ایک زیرک اور خوددار اخبار نویس کا یہ اصول موضوعہ ہونا چاہیے کہ جو الفاظ کسی کے مُنہ سے نکلتے ہیں وہ اُس قوت و اقتدار سے کچھ بڑے ہی ہوتے ہیں، جو کہنے والے کی حمایت کر سکتی ہوں۔ باوجود اس کے جب مصطفٰے کمال کے فاتحانہ حملے اور یونانی فوج کی تباہی کامل کی خبر اس ملک (امریکہ) میں پہنچی ہے تو ہر منبر اور ہر اخبار سے ان دھمکیوں کی متفق اللفظ صدا نکلی کہ "ترکوں کو اُن کے بوریے بدھنے سمیت یوروپ سے لات مار کر نکال دو"، یا یہ کہ "نقشے پر سے ترکوں کا نام و نشان مٹا دو"۔ چند ہی ہفتے نہ گزرے تھے کہ یہ بات فتح مندانہ طور سے پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہ دھمکیاں خالی خولی بچوں کی سی تھیں؛ کیوں کہ بجائے اس کے کہ ترکوں کو لات مار کر یوروپ سے نکال دیا جاتا اُن کے قبضے میں آج یوروپ کا اُس سے زیادہ حصہ ہے جتنا سنہ ۱۹۱۴ء میں تھا، اور اُنھوں نے یوروپ کے لوگوں کو، اُن کے بوریے بدھنے سمیت، ٹرکی سے لات مار کر نکال دیا ہے۔ بہرحال یوروپ کا ایک حصہ اُن کے ہاتھ میں ہے۔ میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ جہاں اور بہت سی مشکل باتیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ کسی کی رائے یکایک نہیں بدلی جا سکتی؛ مگر ایک پختہ کار اخبار نویس کی بڑی قابلیتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی رائے پر نظر ثانی کرے، خاص کر اُس وقت کہ جب غیر ممالک کے معاملات پر بحث کر رہا ہو۔

سچی بات یہ ہے کہ امریکہ کے اخبارات اور عوام الناس نے اپنے فیصلوں کو تعصب اور غلط اطلاعوں کی ریتی سے باندھ رکھا ہے اور اُنھوں نے مشرق قریبہ کے گھوڑدوڑ کے میدان میں غلط گھوڑے پر بازی لگا رکھی ہے۔ اُنھوں نے بآواز بلند اس کا اعلان کیا کہ ترک ہرگز یوروپ

میں واپس نہیں آسکتے؛ باوجود اس کے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ واپس آگئے اور یوروپ کی اُس سے زیادہ زمین پر قابض ہو گئے جس پر وہ پہلے قابض تھے۔ اُنھوں نے تیقن کے ساتھ یہ کہا کہ آرمینیہ آزاد ہونا چاہیے اور سمرنا یونانیوں کے قبضے میں رہنا چاہیے، مگر آج بھی بے غل و غش ترکوں کا جھنڈا ان دونوں سرزمینوں پر اُڑ رہا ہے۔ اُنھوں نے یہ اعلان کیا کہ مغربی سلطنتیں اسکو کبھی نہیں انیں گی کہ شرائط عہدنامہ (متعلقہ علاقہ جات مفوضہ) ٹوٹ جائیں؛ لیکن وہ ٹوٹ گئیں۔ اُنھوں نے بضد یہ کہا کہ ٹرکی کو نہ بری فوج رکھنے کی اجازت دی جاوے، نہ بحری؛ باوجود اس کے آج اُس کی بری فوج دنیا کی بہترین فوجوں میں سے ایک ہے، اور اُس کے جنگی جہازات یہ رُوے معاہدہ اُس کو واپس دے دیے گئے ہیں۔ امریکہ کے اس اندازے سے مجھے ایک وکیل عدالت یاد آتا ہے، جس نے اپنے موکل کو قید خانے میں دیکھ کر کہا تھا کہ: "نیک مرد! تم کو قید خانے میں نہیں ہونا چاہیئے۔ موکل قیدی نے جواب دیا کہ: "مجھے بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے نہیں ہونا چاہیے؛ مگر میں قید خانے میں ہوں"۔

ترکوں کے خصائل اور حالات سے جو ہم کو ناواقفیت ہے اُس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم، من حیث القوم، تعمیم کی طرف مائل ہیں۔ اس طریقے سے دوسرے لوگوں کا اندازہ کرنا ہمیشہ غلط اور خطرناک ہوا کرتا ہے؛ پھر ایسی قوم جیسے ترک ہیں اُس کا اندازہ اس طرح کرنا اور بھی دوگنا خطرناک ہے۔ وہ امریکی بھی جو اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہمیں پورے حالات معلوم ہیں اور وہ لوگ بھی جن کی رائیں عزت کی نگاہ سے دیکھی اور سُنی جاتی ہیں، ترکوں اور ٹرکی کے متعلق ناواقفیت کا مضحکہ خیز اظہار کرتے ہیں۔ اس تمام قوم کے متعلق ہمارے خیالات مشنریوں کی رپورٹوں پر مبنی ہوتے ہیں، جنھیں ترکوں کو عیسائی کرنے میں ناکامیابی ہوئی ہے، یا اُن باتوں پر جو ہم کو یونانی اور ارمنی داعیوں نے سنائی ہیں، یا پائرے لوٹی اور ڈی سیٹرا واکا کے ناولوں پر۔ اگر ہم چند روز کے لیے سردی کے موسم میں بحر روم میں سفر کریں تو ہم کو بہت سے کالی رنگت کے آدمی ترکی ٹوپی سر پر رکھے قہوہ خانوں، بازاروں وغیرہ میں ملیں گے، جن میں ارمنی، شامی، یونانی، اور یہودی، سب ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں، یہی ہمارے اطلاع دہندہ ہوتے ہیں۔

ہم ترکوں سے اس واسطے ناراض ہوتے ہیں کہ اُن میں تعدد ازدواج کی رسم ہے (حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ترکوں کی تمام آبادی میں صرف چار فی صدی ایسے آدمی نکلیں گے، جن کی ایک سے زیادہ بیویاں ہیں) اور ساتھ ہی توریت میں ابراہیم، یعقوب، سلیمان (علیٰ نبینا وعلیہم السلام)

اور بطریارکوں کا حال بڑے اطمینان اور ادب کے ساتھ پڑھتے ہیں: ان کے بھی تو کئی کئی بیویاں تھیں؛ یا بعض امریکی ساہوکاروں اور ریلوے کے متمول مالکوں کو جانتے ہیں جو بیسیوں عورتوں کا گلّے کا گلّہ رکھتے ہیں۔ ان میں اور ترکوں میں کیا فرق ہے؟ صرف یہ کہ ترکوں کے یہاں یہ جائز ہے اور اُن کے یہاں یہ سب پوشیدہ کیا جاتا ہے۔ اس خصوص میں یہ تبلادینا باعثِ دلچسپی ہوگا کہ ٹرکی میں قومی حکومت کے قائم ہونے کے صرف دو برس بعد ۱۹۲۲ء میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا ناجائز قرار دے دیا گیا ہے؛ مگر امریکہ میں انقلاب کے قریباً ایک صدی بعد تک اس کی ممانعت نہیں ہوئی اور اوٹاہ میں تو کھُلے خزانے اب سے چند روز پیشتر تک تعددِ ازواج پر عمل ہوتا رہا ہے۔ بہت عرصہ نہیں گزرا کہ ایک معزز مورمن اوٹاہ میں مرا تھا تو اُس کی چار بیویاں مذہبی رسم تجہیز وتکفین ادا کرتے وقت اُس کے جنازے کی گرد بیٹھی ہوئی تھیں! ہم ترکوں کی عورتوں کی حالت پر ماتم کرتے ہیں، لیکن اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ دنیا بھر میں ٹرکی ہی ایسا ملک ہے جہاں عورتوں کو کابینہ سلطنت میں وزارت تک پہنچا دیا گیا ہے؛ اور اس کو بھی بھول جاتے ہیں کہ کوئی ترکی عورت پیشہ نہیں کرتی۔ جس وقت امریکہ کے ضلع جارجیا میں عورتوں کو بیدیں لگانا ممنوع قرار دینے کی کارروائی ہوئی ہے اُسی کے قریب زمانے میں ترکی عورتوں کا چہرے پر نقاب اوڑھنا ممنوع ہوا ہے۔ ہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ترک غیر رواداراور عیسائیوں سے نفرت کرنے والا آدمی ہوتا ہے، اور بڑی خوب صورتی کے ساتھ اس کو بھول جاتے ہیں کہ اُس نے نہ صرف غیر مسلموں کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنے مذہبوں پر قائم رہیں، بلکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن (مجید) کی ایک سورۃ میں صاف صاف طور پر اپنے غلاموں کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ اگر عیسائی اپنا گرجا بنائیں اور اُن کو مدد کی ضرورت ہو تو اُن کو مدد دیں۔ کیا کوئی شخص اس کا دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس ملک (امریکہ) میں مسلمان مشنریوں کے ساتھ وہی روادارانہ سلوک مرعی رکھا جاوے گا، یا یہ کہ اُن کو وہی رعایتیں اور حقوق دیے جاویں گے جو ہمارے مشنریوں کو ٹرکی میں اُن کے کام شروع کرنے کے وقت سے دیے جاتے ہیں؟ ہم ترکوں کو وحشی کہکر کوستے ہیں اور برطانیہ اور فرانس کے اُن سپاہیوں کی شہادتوں کا لحاظ نہیں کرتے جو ترکوں کے خلاف لڑتے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ترک ہمیشہ صفائی کے ساتھ لڑنے والے ہیں: ہم اس امر واقعہ کو بھی بھول جاتے ہیں کہ تمام دورانِ جنگ میں اُنھوں نے مہذب ممالک کی ایجاد، خلافِ انسانیت چیز، زہریلی گیس کے استعمال سے اس بنا پر قطعی انکار کردیا کہ وہ شریف آدمیوں کا ہتھیار نہیں ہے۔ ہم ترکوں کو بالکل صحیح طور پر اس لیے بدنام

کرتے ہیں کہ انھوں نے ارمنیوں اور یونانیوں کا قتل عام کیا، مگر ساتھ ہی اُن لاتعداد ترکوں کو بھول جاتے ہیں جن کا ارمنیوں اور یونانیوں نے ایشیاء کوچک میں، ارمنیوں نے اور روسیوں نے قفقاز میں، یونانیوں نے البانیا اور کریٹ میں، اور سرویوں اور یونانیوں نے مقدونیہ اور تھریس میں قتل عام کیا۔ ہم ترک کو ظالم سمجھتے ہیں۔ اور وہ ظالم تھا بھی۔ باوجود اس کے اُس نے عراق عرب اور شام کے لوگوں کو اُس سے زیادہ خود مختاری عطا کی جتنی برطانیہ اور فرانس کی عملبرداری نے عطا کر رکھی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن علاقوں کے اکثر لوگ اب بھی اُسے اپنے ملک میں لے آنے کے متمنی ہیں۔ ہم کو یہ کہنے کا بڑا شوق ہے کہ جہاں ترک کھڑا ہوتا ہے وہاں کی گھاس مرجاتی ہے۔ یہ یونانیوں کی پرانی ضرب المثل ہے۔ حالانکہ میں اپنے ذاتی علم کے مطابق یہ شہادت دے سکتا ہوں کہ جب تک یونانیوں کی سنگینوں نے ترکوں کے ہلوں کو وہاں سے خارج نہیں کردیا، تھریس اور اناطولیہ زرخیز علاقے اور نسبۃً مرفہ الحال تھے۔ ہمارا یہ دعوے ہے کہ ترکوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے، لیکن اس قول کو آپ اس امر واقعہ سے کیسے مطابقت دیں گے کہ مغربی ایشیا کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک ترکوں کے معمولی بیانات پر اعتبار کرلیا جاتا ہے اور دیسی عیسائیوں کی قسموں پر۔ خواہ وہ کیسی ہی ہوں۔ اعتبار نہیں کیا جاتا۔ براہِ عنایت اتنی بات اور بتادیجیے کہ اگر ترک ایسا ہی کالا ہے جیسی ہم اُسکی تصویر کھینچتے ہیں تو اس امر واقعہ کی کیا وجہ ہے کہ ہر ملک غیر کا آدمی جو ترکوں کو جانتا ہے، خواہ وہ سیاسی مدبر ہو یا کانسل، یا بری و بحری فوج کا افسر، یا تاجر، یہاں تک کہ مشنری بھی، اُس کی تعریف بحیثیت ایک فرد کے پکارے گلے کرتا ہے؟ ہم یہ سوچ کر خوش ہوتے ہیں کہ وہ سیاسی اور فوجی نقطۂ نظر سے ناقابل اعتنا ہے، باوجود اس کے اُس نے یونانیوں کی ایک فوج کا، جو اُس کی فوج سے، باعتبار ذرایع و آراستگی، بہت زیادہ اچھی تھی، کس طرح نام و نشان مٹادیا، تمام اناطولیہ اور مشرقی تھریس کو لے لیا؛ اٹلی والوں کو کس طرح مجبور کیا کہ وہ اڈالیہ سے اپنے ہاتھ اُٹھالیں؛ فرانس کو کس طرح مجبور کیا کہ وہ سلیشیا کو خالی کردے اور شام کے حدود کو اپنی مرضی کے موافق کس طرح تبدیل کرالیا؛ برطانیہ کو کس طرح مجبور کیا کہ وہ قسطنطنیہ اور دردانیال سے نکل جاوے؛ اسی میں لائڈ جارج نے اپنی وزارت کھوئی گوناریس اور اُس کے رفقاء کی جانیں گئیں، کانسٹنٹین نے اپنا تخت کھویا، کرزن اور وینی زلاس پر ہر طرح کی سیاسی فتح حاصل ہوئی، سیورے کا ناپاک معاہدہ چاک ہوا اور اُس کی جگہ لوزان کا معاہدہ رکھا گیا اور امریکہ کے ساتھ ایک معاہدہ ہوا، جو ٹرکی کے موافق مطلب ہے۔ ترکوں کی اس روش نے عیسائی دنیا میں اتحادیوں کی عزت و آبرو کی جڑیں اُکھاڑ کر پھینک دیں۔ یورپ اور امریکہ کے عذر خواہ اس کی بیکار کوشش کررہے ہیں

کہ ان تمام کامیابیوں کو کم کرکے دکھلائیں، واقعات خود اپنی شہادت دے رہے ہیں ۔

اگر در خانہ کس است ہمیں قدر بس است (مترجم)

"فلسفۂ عشق"

(جناب مولوی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم بی اے ایل ایل بی)

گیتوں کے نرم راگ سے مسحور ہے فضا معمورِ وجد روح سے رب کائنات ہے
موسیقیت کے تار پہ رقصاں ہے ہر نفس کیفیتِ سرور سے لبریز بات ہے
لیکن ذرا سی دیر میں مٹ جائیگا یہ لطف کیفِ آفریں رباب کی اتنی حیات ہے
جس طرح لَو بھڑکتی ہے بجھتے چراغ میں
نغموں کا ارتعاش رہے گا دماغ میں

گُل کی شمیم خوش سے معطر ہے گلستاں احساسِ شامہ میں اسی سے ہے تازگی
اتنے لطیف ہوتے ہیں اس کے تاثرات برگ و ثمر پہ چھایا ہے اک کیفِ بیخودی
تو ام چمن میں گرچہ ہیں گُل اور بوئے گُل اس کی فنا کے بعد بھی ہے اُس کی زندگی
بحرِ فنا میں خاک بھی پھولوں کی بہہ گئی
تخئیلِ بو کی پھر بھی دماغوں میں رہ گئی

اک پھول ہے گلاب کا گلشن میں جلوہ بار جیسے کوئی حسین کسی جا ہو محوِ خواب
اس کا وجود باعثِ تزئینِ حُسنِ مست اس کے سبب سے عشق کی دنیا میں انقلاب
گو موسمِ بہار تک اس کی بہارِ حُسن دَورِ خزاں کے آنے تک اسکا یہ سب شباب
مرجھا کے بھی ہے مشغلۂ خوب کے لیے
سیجیں بنائی جائیں گی محبوب کے لیے

نغموں کے بعد بھی رہا نغموں کا ارتعاش پس از فنا بھی صوت رہی گوشِ خام میں
گلشن میں پھول کا نہیں باقی ہے کچھ نشاں نکہت کی مے بھری ہے دماغوں کے جام میں
بیکار ہے خزاں میں گلابِ چمن مگر اوراقِ منتشر ہیں حسینوں کے کام میں
یوں ہی ہمارا نام رہے گا بنامِ عشق
"ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ عشق"

محبت

(جناب مسٹر مظفر علی صاحب قدوائی)

آپ نے محبت تو کی ہی ہوگی۔ اور اگر ابھی تک اس جذبہ سے آپ روشناس نہیں ہوئے ہیں تو اب آپ کو ہونا پڑیگا۔ کیونکہ یقین جانیے کہ یہ مرض خسرہ سے کسی طرح کم نہیں ہے جو ہر شخص کو زندگی میں ایک مرتبہ ضرور ہوتا ہے۔ اور بالکل اُسی طرح یہ زندگی میں صرف ایک ہی مرتبہ ہوتا بھی ہے جو ایک مرتبہ اُسے جھیل گیا اُسے دوبارہ پھر اس کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ جو شخص محبت کا شکار ہو چکا ہے وہ بڑی خاطر جمعی سے خطرناک ترین مقامات پر جاسکتا ہے اور ہر قسم کی حماقتوں کا مرتکب ہو سکتا ہے خطرناک مقامات سے میرا مقصد نہ تو دہشت خیز جنگل ہے اور نہ حماقتوں سے مقصد خودکشی۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہر قسم کے باغوں میں ہر وقت تفریح کر سکتا ہے۔ گنجان درختوں کی چھاؤں میں اطمینان قلب کے ساتھ بیٹھ، لیٹ، بلکہ سو بھی سکتا ہے۔ سمندر کے کنارے ڈوبتے سورج کے سحر آگیں نظارے سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ عورتوں کے مجمع میں شریک ہو کر دریا کی سیر کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ دوست کی شادی میں شرکت کر کے رسوات کے خطرناک زنانہ میں بھی بے کھٹکے گھس سکتا ہے۔

وہ محفل رقص و سرود میں اپنے دماغی توازن کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اور سرد سے سرد مقام پر چاندنی راتوں میں ٹہل سکتا ہے۔ پھر بھی میں یقین دلاتا ہوں کہ اُسے بجز خفیف سے زکام کے اور کوئی مرض لاحق نہیں ہو سکتا۔ وہ بیخود کر دینے والے نغمے سنتا ہے اور اُسکا "حقوق محفوظ شدہ" دل اُن سے کوئی اثر نہیں لیتا۔ وہ نازک، نرم، سڈول اور حسین ہاتھوں سے مصافحہ کرتا ہے لیکن کوئی "برقی لہر" اُسے اس پر مجبور نہیں کرتی کہ وہ ان ہاتھوں میں ایک کھلونے کی طرح بے بس ہو جائے۔

ہرگز نہیں۔ محبت کا مرض کبھی دوہراکے ہوتا ہی نہیں۔ معصوم فرشتہ محبت ایسا اناڑی نہیں ہے کہ ایک دل کی خاطر دو تیر خراب کر دے — اور محبت کی خادائیں" رفیق دائمی ہوا کرتی ہیں۔ اُدھر محبت خانۂ دل میں جلوہ گر ہوئی اُدھر خانۂ دل کے تمام پھاٹک، دروازے اور کھڑکیاں کھل گئیں۔ لیکن معزز ناظرین محبت صرف ایک مرتبہ ان راہوں سے گزر کر مملکت قلب پر قابض

ہو جاتی ہے اور تمام حقوق بحق مالک و مختار محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اب اگر ہم کو کوئی چیز بھلی بھی معلوم ہو تو ہم اُسکی تعریف کرنے کے مجاز نہیں ــــ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ہم کسی کی دستی کی یاد اور اُس کی گُدگُدی کے کیف کو دل میں محسوس کریں۔

انسان کا دل ایک آتشبازی ہے جو تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ چھوٹ جاتی ہے۔ اور شہاب ثاقب کی طرح ایک لمحہ کے لیے روشن ہو کر تمام کائنات کو اپنی ضیا سے ماموکر دیتی ہے ــــ اسکے بعد ہماری روزمرہ زندگی کی تاریک راتیں ہمارے گرد احاطہ کرلیتی ہیں۔ چھُٹی ہوئی آتشبازی زمین پر پڑی رہ جاتی ہے ــــ محبت کے جذبات سے متاثر ہو کر ہم قدرت کی سختیوں سے یکایک اتفاقاً آزاد ہو جاتے ہیں، بہادروں کی طرح بلندیوں پر چڑھنے کی سعی کرنے لگتے ہیں۔ اور کوہ طور سے آگ لانے کے دعویدار ہو جاتے ہیں۔ سچ ہے کہ وہ لوگ جو شرارے جذبات کے مردہ ہونے سے پیشتر ہی اپنے دلوں کی شمعیں محبت کی دیا سلائی سے روشن کرلیتے ہیں بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں۔ لیکن محبت ان مسموم ہواؤں میں جن سے دنیا کی فضا بھری ہوئی ہے بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ پھر بھی قبل اسکے کہ دنیا کی ناپاک ہوا اس مقدس شعلہ کو بجھا دے ہم کو چاہیے کہ ہم اپنے دلوں کی تاریکی میں یہ روشنی پیدا کرلیں۔ اور اس حشر جذبات کو احساس لطف سکون میں تبدیل کرلیں۔

اگر توجہ کی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ہماری دنیا کے چھوٹے اور غریب گھروں کے "لطف و ستائش" کی "خفیف گرمی" محبت کی دہکتی ہوئی آگ سے زیادہ موزوں ہے۔ محبت کو تو دراصل کسی عبادتگاہ کی دہکتی اور بھڑکتی ہوئی شمع ہونا چاہیے۔ یہ مست کردینے والا راگ دراصل نغمہ کائنات ہے "لطف و ستائش" کے احساسات صرف اُسی وقت خوشگوار گرمی پہونچا سکتے ہیں، جبکہ محبت کے بھڑکتے ہوے شعلے خاموش ہو جائیں۔ کیونکہ "لطف و اُنس" کی آگ میں آپ روز تھوڑا تھوڑا ایندھن ڈال سکتے ہیں اور اس ایندھن کے انبار کو اتنا بلند کرسکتے ہیں کہ ضعیفی کی سرد دہریوں میں بھی اسکی گرمی قائم رہ سکے۔ عمر رسیدہ مرد اور عورتیں اس کی ہلکی گرمی سے لطف اندوز ہو سکیں بچے اپنے ہاتھ تاپ سکیں اور دوست اور ہمسائے کو اس سے گرمی حاصل کرنے کی دعوت دی جا سکے۔ برخلاف اسکے محبت کا بلند شعلہ جہاں خود انتہائی تپش کا حامل ہوتا ہے وہاں ہر اس اُس چیز کو جو اُسکے قریب پہونچ جائے خاکستر کردیتا ہے۔ اس لیے "آتش لطف و ستائش" میں گرمی قائم رکھنے کے لیے ہمیں ہر وقت "مہربانی" کے ایندھن کی ضرورت ہے۔ نرم اور ملایم

گفتگو، دوستانہ تعلقات اور ایثار اسکی گرمی کو دیرپا بناتے ہیں۔ اگر اس میں خوش مذاقی، صبر اور عفو کی ہوا دی جائے تو ہم کو نہ توسیل گریہ کا اندیشہ، نہ طوفان باراں کا خطرہ، کیونکہ باوجود زمانے کی مخالفت کے وہ گھر جس میں ایسی آگ موجود ہو ہر وقت بشاش رہ سکتا ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ نوجوان "محبت" سے خلاف معمولی توقعات رکھتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ ان کے جذبات کی گرمی اس آگ کو ہمیشہ روشن رکھ سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اس غیر مستقل شعلہ پر اتنا اعتماد مناسب نہیں۔ زمانہ اس شعلہ کو بجھانا چاہتا ہے۔ اور پھر اسکے قیام کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہوتی۔ ہر شخص اسکو بجھتا ہوا دیکھتا ہے اور ناامید ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصور در اصل فریق ثانی کا ہے ———— "زاہد" کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اب اسکے استقبال کے لیے اُس کی "زاہدہ" مسکراتی ہوئی دروازے تک دوڑ کر نہیں آتی۔ اور جب اُسے کھانسی ہو جاتی ہے تو "زاہدہ" حسب معمول روتی نہیں اور اُسکے گلے میں گداز بانھیں ڈال کر یہ نہیں کہتی کہ "پیارے زاہد، تم کو کیا ہو گیا۔ تمھارے بغیر میں کیسے زندہ رہونگی؟" بلکہ وہ کھانسی کی گولیاں بڑی سنجیدگی سے تجویز کر دیتی ہے، اور وہ بھی اس انداز سے کہ گویا زاہد کی کھانسی کا شور ناگوار ہے ورنہ علالت چنداں پُر تردد نہیں ہے۔

بیچاری "زاہدہ" اس لیے روتی ہے کہ اب "زاہد" نے اُس کا "پُرانا رومال" اپنی شیروانی کی جیب میں رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ غرضکہ دونوں ایک دوسری کی کمی پر متحیر ہوتے ہیں اور اپنی تبدیلی پر نظر نہیں ڈالتے۔ اگر ان کو اپنی لغزشوں کا احساس ہو جائے تو شاید اتنی تکلیف نہ ہو اور وہ ان ظاہری بے التفاتیوں کے وجود کا مناسب سبب معلوم کرلیں، اپنی غلطیوں کو مان کر ایک دوسرے کے شریک کار ہو جائیں اور اپنی زندگی کو دنیا کے مطابق بنا کر ایک مضبوط ترین بنیاد قائم کریں۔

لیکن انسان آنکھیں ہوتے ہوئے بھی اندھا ہی ہوتا ہے۔ اُسے اپنی لغزشوں کا اندازہ ہوتا نہیں اور دوسروں کی کمزوریوں کا متلاشی رہتا ہے۔ ہر شخص کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ اسکے ساتھ بدسلوکیاں ہو رہی ہیں وہ مطلقاً کسی دوسرے کی غلطیاں ہیں ورنہ اُس نے تو کچھ نہیں کیا۔

"زاہدہ" ہمیشہ، ہمیشہ، اور ہمیشہ زاہد سے محبت ہی کرتی رہتی اگر "زاہد" خود اتنا سرد اور بے توجہ ہو گیا ہوتا۔ "زاہد" اسی طرح "زاہدہ" کی پرستش کرتا رہتا اگر "زاہدہ" بالکل ویسی ہی ہوتی جیسی کہ ابتدائے محبت میں تھی۔ "چراغ محبت" کے خاموش ہونے سے "آتش لطف و انس" کے جلنے میں جو وقفہ ہوتا ہے وہ ہر شخص کے لیے غیر دلچسپ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت انسان کو سردھنا

میں گرمی کی جستجو ہوتی ہے۔ خدا کرے کہ یہ آگ دن ڈھلنے سے پہلے جل جائے۔ بہت سے لوگ تو ٹھنڈی راکھ کے پاس بیٹھ کر اُس وقت تک کا نپا کرتے ہیں جب تک کہ روز حیات تاریکی ممات سے نہیں بدل جاتا۔

لیکن اس نصیحت سے کیا حاصل ہے "کس" چاہنے والے "کو اس کا گمان بھی ہوتا ہے کہ یہ جذبہ کبھی سرد پڑ جائے گا۔ ایک بیس برس کا لڑکا یہ کیسے باور کرے گا کہ جب وہ ساٹھ برس کا ہوگا تو اُس کے جذبات محبت اتنے ہی حشر خیز نہ رہیں گے۔ اُسے کوئی ایسی نظیر یاد ہی نہیں آتی لیکن نظیر یاد کرنے کا وقت بھی کسے ملتا ہے ——— اُس کو یقین ہوتا ہے کہ اُس کی محبت کبھی کم نہیں ہوسکتی، خواہ تمام کائنات سے محبت مفقود کیوں نہ ہو جائے۔ وہ اپنے دل میں سمجھتا ہے کہ آج تک دنیا میں کسی نے اُس جیسی محبت نہیں کی اور اس لیے دوسروں کے تجربے اُسکے لیے کوئی نظیر نہیں بن سکتے۔ ایک حد تک اس کا قصور نہیں ہے۔ ہمارے جذبات خواہ بُرے ہوں یا بھلے، ہمارے شباب کے ساتھ بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ ہم تیس برس کی عمر کو پہنچ کر بیس برس والوں کی طرح نہ تو محبت کر سکتے ہیں اور نہ اتنی نفرت۔ کیونکہ کبرسنی میں نہ تو ناکامیاں جذبۂ خودکشی پیدا کر سکتی ہیں اور نہ کامیابیاں جنون بنا سکتی ہیں۔

جیسے جیسے ہم معمر ہوتے جاتے ہیں ہر چیز کے جزئیات پر بھی نظر غائر ڈالنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے اس دور میں شاذ ہی کوئی ایسا موقع ہوتا ہے جسے "شاہی عظمت کا مترادف کہا جا سکے۔ حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔ عزت اور آبرو احاطۂ عقل میں آجاتی ہیں" اور زندگی رفتہ رفتہ اتفاقات کے مطابق ہو جاتی ہے ——— رہی محبت! سو محبت تو مردہ ہو چکی ہوتی ہے ——— "جوانی کے خوابوں کی بے عظمتی" ہمارے دلوں پر دم گھونٹنے والے کہر کی طرح چھا جاتی ہے ——— نرم کونپلیں اور خوش رنگ کلیاں کھلنے سے پہلے مرجھا جاتی ہیں اور شراب کے اُس سرور کے عوض جو کبھی تمام کائنات کو محیط کیے تھا ایک بیجا اور مایوس کن خمار رہ جاتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میرے حسین اور نوجوان ناظرین اسے ہذیان مطلق تصور کریں گے۔ کیونکہ اُس وقت تک کسی انسان کی باتیں قابل توجہ نہیں ہوتیں جب تک کہ اس کے بالوں کی سفیدی اُسکی کہنہ مشقی کی تائید نہ کرے ——— اور بوڑھا ہو کر آدمی سٹھیا جاتا ہے ——— نوجوان عورتیں ہم مردوں کا اندازہ اُن ناولوں سے لگاتی ہیں جنھیں عورتیں ہی تصنیف کرتی ہیں۔ اور یہ دنیا پر

روشن ہے کہ ان ناولوں میں جس طرح مردوں کو پیش کیا جاتا ہے اُسکے مقابلہ میں "پائی تھاگورس" کی "لنڈورسی چڑیا" اور "فرنیکسٹین کا بھوت" بھی جذبۂ انسانیت کے زیادہ حامل سمجھے جاتے ہیں۔

ان کتابوں میں اصلی عاشق کو "یونانی دیوتا" کہا جاتا ہے جو بذات خود تحسین حسن کا کافی ثبوت ہے۔ لیکن اسکا پتہ نہیں چلتا کہ یہ "یونانی دیوتا" دراصل کون سا "دیوتا" ہے۔ ممکن ہے کہ اس فقرہ سے "کوزہ پشت ولکن" مراد ہو یا "دو رُخہ جینس"۔ ممکن ہے کہ "بد طینت سائیلینس" سے مراد ہو جسکو خدائے شیطنت کہا جاتا ہے۔ غرضکہ وہ یونانی دیوتاؤں کے پورے خاندان کا مجموعہ واحد ہوتا ہے۔ اور اس لیے بے حد سب کچھ۔ اور شاید یہی اس "دیوتا" کی مشابہت کا مقصد بھی ہو ممکن ہے کہ وہ اپنی ثقاہت، کمزوری اور خلقی ناتوانیوں کے باعث اس مفروضہ شجاعت کا بھی دعوے دار نہ ہو جو کتابوں میں اس کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اور چالیس سال کی عمر کو تجاوز کر کے "لاغر اتنا ہوں کہ تو گر بزم میں جا دے مجھے ٭ میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے" ہو جائے۔ لیکن اس عمر رسیدہ لوگوں کے اُن جذبات کی گہرائیاں جو کسی کمسن لڑکی کو دیکھ کر ان میں پیدا ہو جاتے ہیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کی تہ تک پہونچ جانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے۔ اس لیے اس مجمع میں جہاں عمر رسیدہ اور "سفید ہو" عاشق موجود ہوں نوجوان "فرہاد وں" اور "مجنونوں" کا گزر ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ان کی محبت کی سرگرمیاں اتنی زور دار ہوتی ہیں کہ اُنھیں احاطۂ بیان میں لانا ہی غیر ممکن ہو جاتا ہے۔

ہم ایسے "ناداں گناہگاروں" کے لیے یہی اچھا ہے کہ معزز خواتین صرف کتابیں ہی پڑھا کرتی ہیں اگر ان کو "نفسیات انسانی" سے ذرا سا بھی تعلق ہو جائے تو وہ بخوبی سمجھ سکیں گی کہ ایک لڑکی کی چھپتی ہوئی "لکنت" ایک معمر انسان کی "مردانہ گوئی" سے کہیں زیادہ "صادق الجذبات" اور قابلِ وقعت ہوتی ہے۔ ایک کمسن لڑکا اگر محبت کرتا ہے تو اُسکے جذبات بالکل سیدھے دل ہی سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک عمر رسیدہ مرد کے جذبات "تلہ کی سستی" سے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک معمر مرد کی سست گفتگو محبت سے تعبیر نہ کی جاسکے گی۔ اور خاص کر اس حالت میں جب اس کا مقابلہ ایک نوجوان کے جذبات سے کیا جائے گا جو اس کے دل سے اُس وقت اُبلنے لگتے ہیں جب آتش حُسن اُس کو گرم کر دیتی ہے۔ اگر کسی کو لطف محبت کی تمنا ہے تو اُسے اُس چشمہ سے پانی پینا چاہیے جو ابھی اُس کے قدموں پر بہا دیتی ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ دریا کی موجوں کو پکڑنے کے لیے اُس وقت تک انتظار کیا جائے جب تک کہ پانی گندلا نہ ہو جائے ـــــ کیا آپ ایک

بودار پانی کو صاف اور شفاف پانی پر ترجیح دیں گے؟ کیا پانی کی گندگی آپ کے "مقدس ہونٹوں" کو زیادہ مرغوب ہے؟ کیا ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ایک نوعمر دوشیزہ اُسی طرح پر اعتماد کر سکتی ہے جو گنہگار زندگی کی گندگیوں سے آلودہ ہو چکا ہے۔

غرضکہ ایسے ناولوں کے "زرد اوراق" اسی قسم کی تبلیغ کیا کرتے ہیں۔ کیا انکے مصنف ایک لمحہ کے لیے بھی اس پر غور کرتے ہیں کہ وہ خدا کی پُرکیف دنیا میں یوں پوشیدہ طور پر چل پھر کر کیا گندگی پھیلا رہے ہیں اور معصوم "حواؤں" اور بے گناہ "آدموں" کو یہ بتا رہے ہیں کہ "گناہ" کی برابر شیریں چیز اور کوئی ہے ہی نہیں۔ — اور شرافت اور انسانیت سراسر بیہودگی ہے ——— کتنی معصوم لڑکیاں ان ناولوں کو پڑھ کر آوارہ خیال نہیں ہوتیں؟ اور کتنے کمزور نرمے ان کے ذریعہ اُس غلط راہ سے آگاہ نہیں ہو جاتے جو ان ناولوں کے بقول سیدھی نوعمر دوشیزاؤں کے دلوں تک جاتی ہے ——— وہ زندگی کو اس رنگ میں ہرگز نہیں دکھاتے جو واقعی اس کا ہے۔ انسان اگر سچ بولے تو صداقت اُس کی خود نگرانی کر لیتی ہے۔ لیکن وہ تصاویر جو ان ناولوں کے ذریعہ پیش کی جاتی ہیں دراصل ایسی بدنما خیال آرائیاں ہیں جو اُن کے پراگندہ دماغوں سے نکلتی ہیں۔

ہمارا خیال عورتوں کی بابت ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ خود اپنے کو ظاہر کرتی ہیں ——— اُنکے خیال میں عورت ایک ایسی کھو دینے والی چیز ہے جو انسان کو مجنوں بنا کے تباہی کی طرف لیجاتی ہے۔ لیکن ہم عورت کو ایک نیکی کا فرشتہ تصور کرتے ہیں جو انسان کو رفعتِ عرش کی طرف راغب کرتا ہے۔ عورتوں میں اچھائی بُرائی کی ایسی بڑی طاقتیں ہیں جنکا خود اُن کو گمان بھی نہیں ہے۔ جس عمر میں انسان کے چال چلن کو پختگی ہوتی ہے اُسی عمر میں وہ "شکارِ محبت" ہوتا ہے۔ اور اُس وقت اسکی "محبوبہ" کے اختیار میں ہے کہ اُسے بلند کر دے یا ذلت اور رسوائی کے گڑھے میں دھکیل دے۔ نادانستہ طور پر وہ اپنے کو اپنی محبوبہ کے مطابق نیک یا بد جیسا وہ چاہتی ہے بنا لیتا ہے ——— اور مجھے یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ عورتیں اپنے اس اثر کو ہمیشہ بہتری کی طرف کام میں نہیں لاتیں ——— اکثر عورتوں کی دنیا "عامیت" سے محدود ہوتی ہے۔ ان کے مطمحِ نظر پست اور کم حوصلہ ہوتے ہیں اور اس معیار پر اُترنے کے لیے اکثر طاقتور مرد محبت سے مبہوت ہو کر اپنی زندگی گمنامی اور پستی میں بسر کر دیتے ہیں۔

پھر بھی اگر عورت چاہے تو مرد کو بیحد اچھا بنا سکتی ہے، اور تمام واعظوں کے مقابلہ میں اس

دنیا کو بہشت بنا دینے کے لیے ایک عورت کی بھی کوشش زیادہ کامیاب ہوسکتی ہے - ابھی تک عالی ہمتی مردہ نہیں ہوئی ہے - لیکن بیکار رہونے کی وجہ سے سو ضرور گئی ہے اور صرف عورتیں ہی اسکو بیدار کرسکتی ہیں - عورتوں کو اس قابل ہونا چاہیے کہ بڑے بڑے جوانمرد انکی پرستش کریں —— دنیا کی بڑی جنگوں میں سے اکثر صرف عورت ہی کی خاطر ہوتی ہیں —— آدم نے بھی عورت ہی کی خاطر جنت کو ترک کیا تھا - اس لیے اسے حسین عورتو - تمھارے لیے یہ ضروری ہے کہ حسن صورت کے ساتھ تم میں حسن سیرت بھی ہو - تاکہ اعلیٰ ہمت مرد تمھاری خدمت سے عظمت اور نام حاصل کریں۔ اپنے "خودغرضی کے لبادوں" کو اتار کر پھینک دو اور "ظاہری نمائش" سے درگزر دو - اور ایک مرتبہ پھر "فطری نفاست" کے ساتھ ملکہ کی طرح اپنی مملکت میں کھڑی ہو جاؤ —— ہزاروں تلواریں جو اس وقت بیکاری نے باعث زنگ کھا رہی ہیں تمھاری عزت کے قیام کے لیے نیاموں سے نکل پڑیں گی اور دنیا کی تمام گندگیاں تمھاری پاک طینتی کے پریم کے سامنے نیست و نابود ہو جائیں گی

"محبت کے زمانے" میں انسان کس شریف کام کا اہل نہیں ہوتا؟ —— اور اپنی محبوبہ کی خاطر کون سی "پاک زندگی" گزارنے سے گریز کرسکتا ہے —— ایک زمانہ میں محبت ایک مذہب تھا جس کی خاطر لوگ جانیں دے دیا کرتے تھے —— اس وقت انسان اپنی طرح کے جسم خاکی سے محبت نہ کرتا تھا —— وہ ایک ملکہ کا مطیع ہوتا تھا اور ایک مقدس دیوی کا پجاری —— آہ! وہ پرستش کس قدر مجنونانہ تھیں اور کیسی دلچسپ'

لڑکو! محبت کے خوابوں سے اس وقت تک لطف اٹھاؤ جب تک کہ وہ ختم نہ ہوجائیں اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ زندگی میں کوئی چیز اتنی شیریں نہیں ہے —— محبت میں جو دقتیں پڑتی ہیں وہ بھی بڑی دلچسپ اور عجیب ہوتی ہیں —— جب انسان جذبۂ محبت کھو جاتا ہے اور اس کی زندگی سے یہ روشنی جاتی رہتی ہے —— اسوقت اسے یہ دنیا ایک وحشت خیز تاریکی معلوم ہونے لگتی ہے اور اس حالت میں بھی ناکامیوں میں ایک خاص لطف ہوتا ہے —— پھر خود ہی سوچو کہ اس کے لطائف حاصل کرنے کے لیے کون دشواریوں کا سامنا بخوشی نہ کرے گا —— وہ خوشیاں کس قدر روح پرور ہوسکتی ہیں جنکا خیال ہی انسان کے جسم میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے - کسی عورت سے اظہار عشق کرنا کتنا پُرلطف ہوتا ہے —— انسان یہ کہکر کہ "وہ اس کی خاطر جیتا ہے اور اسی کی خاطر مرنے پر آمادہ ہے" کس قدر ناز کرتا ہے - اور جب عورت اس اظہار کے بعد بھی تجاہل سے اس پر بے اعتمادی کا اظہار کرتی ہے تو مرد کی کیا حالت ہو جاتی ہے - لیکن ان

تمام باتوں کے باوجود مرد ہمیشہ عورت کی فریب کاریوں میں لطف حاصل کرتا ہے اور اپنی بیگناہی کا یقین رکھ کر بھی اُس سے معافی مانگنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

عورت اکثر مرد کو محض دق کرنے کے لیے اُسے ٹال جاتی ہے۔ اُسے مرد کی مظلومانہ حالت میں میں لطف آتا ہے اور جب وہ مسکراتی ہے تو تمام کائنات مسکرا اُٹھتی ہے۔ مرد اپنی محبوبہ کے سایہ سے بھی رشک کرتا ہے۔ ہر اُس مرد سے نفرت کرتا ہے جس سے وہ مصافحہ کرتی ہے اور ہر اُس عورت سے جلنے لگتا ہے جسے وہ بوسہ دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ اُسے اُس کی خادمہ، اُسکے ملازم، حتیٰ کہ اُسکے کتے تک سے جلن ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ایک اُسی کی ذات میں وہ سب باتیں ہو جائیں جو ہاتھوں میں علیحدہ علیحدہ ہیں تاکہ وہ تنہا ہی اپنی محبوبہ کے ہمراہ رہ سکے۔

وہ حماقت کے دن بھی کتنے پُر لطف تھے جب انسان خود غرض نہ تھا اور اسکے خیالات برائیوں سے مبرا تھے۔ جبکہ اس کا دل نیکیوں سے معمور تھا، اور اب وہ زمانہ آگیا ہے جبکہ انسان اپنے خیال میں دانشمند اور مہذب ہو گیا ہے۔ لیکن اسکے دلوں میں بغض و حسد کی لپٹیں اُٹھ رہی ہیں۔ وہ خیال کرتا ہے کہ صرف روپیہ ہی حاصل حیات ہے، اُسے صرف دروغگوئی اور کمینہ پن پر اعتماد ہے اور اپنے سوا کسی کی پروا نہ بھی نہیں کرتا ہے۔

بال جبریل کی ایک طرح پر

حیات خونِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں
علاج اس کا گُزر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ حُسن و عشق یہ دنیائے آب و گِل یہ حیات
فریبِ حسنِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں

یہی تو تیری عطا تھی سو وہ بھی ہے ناقص
بشر کے پاس نظر کے سوا کچھ اور نہیں

دل ایک چیز ہے دنیا سے جذب و مستی میں
چمن میں اس گُلِ تر کے سوا کچھ اور نہیں

الٰہی اب یہ دعا ہے کہ ہو عطا مجھ کو
وہ اک نفس کہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

ہم اہلِ عشق کریں نذر کیا اُنھیں کہ یہاں
متاعِ دردِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

بیانِ حالتِ دل کو ہم اہلِ عشق کے پاس
زبانِ دیدۂ تر کے سوا کچھ اور نہیں

عزیز نفع ہو جس کو ادھر نہ آئے جلیل
مآلِ عشق ضرر کے سوا کچھ اور نہیں

جلیل قدوائی

قزاق

(جناب مولوی مطلب حسین صاحب عالی بی اے لکھنوی)

گرمی کا موسم تھا اور سہ پہر کا وقت۔ دن بھر سخت گرمی پڑ چکی تھی۔ جسکی وجہ سے حدت کا کافی اثر موجود تھا۔ حسب معمول مکان سے باہر نکل کر چبوترہ پر بیٹھا ہوا میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ داروغہ صاحب آگئے۔ داروغہ محمد جنید صاحب کہیں دور سے آرہے تھے پسینے میں تر بتر تھے۔ آتے ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے میں نے پان پیش کرکے پوچھا "معلوم ہوتا ہے آج آپ بہت دور سے آرہے ہیں"؟

داروغہ صاحب جو اپنی ملازمت کا زمانہ ختم کر چکے تھے اور پنشن پاتے تھے بولے "جی ہاں وقف کے قصے میں مصروف تھا۔ اُسکا کام بھی مجھے دیکھنا پڑتا ہے"۔

میں نے کہا "کونسا وقف؟

داروغہ صاحب نے جواب دیا "وہی مسجد وسرلے کا قصہ ہے"

میں نے اُس سے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ داروغہ صاحب نے کہا "کیا میں نے کبھی آپ سے اس وقف کا تذکرہ نہیں کیا؟"

میں نے کہا "نہیں"

وہ بولے "اچھا آج آپ کو اس کا واقعہ سناتا ہوں۔ کافی دلچسپ افسانہ ہے"

میں ہمہ تن گوش ہوگیا، اور داروغہ صاحب نے کہنا شروع کیا۔

اب سے تقریباً سات سال پہلے جب میں اپنی ملازمت کا زمانہ قریب قریب ختم کر چکا تھا، ایک دن ایک تحقیقات کے سلسلے میں بازار سے گزر رہا تھا۔ بازار میں ایک جگہ دو آدمیوں میں کچھ سخت کلامی ہو رہی تھی۔ ایک نوجوان اپنے روپیہ کو اچھا ثابت کر رہا تھا اور دوسرا اس کو کھوٹا بتاتا تھا۔ لوگوں نے مجھے گھوڑے پر گزرتے دیکھا تو جھگڑنے والوں سے کہنے لگے کہ داروغہ جی کو دکھا دو اگر وہ اچھا کہیں تو لے لو ورنہ واپس کر دو۔ اس پر سب لوگوں نے اتفاق کیا، لیکن مجھکو، ابھی جب کہ میں کسی قدر فاصلہ ہی پر تھا، اُس نوجوان نے بھی دیکھا اور فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر ایک سمت کو چل دیا۔

میں معاملہ کی اہمیت کو بالکل نہیں سمجھا۔ نہ سمجھ سکا کہ وہ نوجوان مجھکو دیکھ کر کیوں بھاگ گیا اسی خیال میں تھا کہ میں نے بھی اپنے گھوڑے کو تیز کیا اور اس کا تعاقب شروع کیا۔ شہر

سے باہر نکل کر میں نے اس نوجوان کو بہت دور پر جاتے دیکھا۔ وہ اُسی تیزی سے جا رہا تھا میں نے اپنے گھوڑے کو اور تیز کیا۔ میں بہت تیز جا رہا تھا، لیکن ہمارے درمیان فاصلہ بہت تھا۔ میرا گھوڑا بہت عمدہ تھا، لیکن پھر بھی میں اُس نوجوان تک نہ پہونچ سکا۔ اس دوڑ میں کئی گھنٹے گزر گئے اور شام ہو گئی۔ لیکن ابھی وہ نوجوان میری نظروں سے اوجھل نہ ہوا تھا۔ میں برابر اسکے پیچھے چلا جاتا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ اور گزرا ہوگا کہ رات ہو گئی۔ سورج غروب ہو گیا۔ لیکن چونکہ چاند نکل آیا تھا لہذا اب بھی میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ اور برابر چلا جاتا تھا۔ میرے دل میں ایک عجب قسم کا شوق پیدا ہو گیا تھا کہ معلوم کروں کہ وہ کون ہے اور کیوں اس طرح خوفزدہ ہو کر بھاگ رہا ہے۔ اس بنا پر میں نے تعاقب جاری رکھا۔ چاندنی نکلی ہوئی تھی اور میں برابر اس کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اب مجھے نا امیدی شروع ہوئی کہ میں کبھی اُس نوجوان تک نہ پہونچ سکوں گا، اس لیے میں نے اُس سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا لیکن معلوم نہیں کہ اُسنے میرے اشاروں کو دیکھا یا نہیں۔ اُس نوجوان نے اپنی رفتار حسب دستور قائم رکھی یکایک وہ میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

میں شہر سے کم از کم چالیس پینتالیس میل کے فاصلہ پر ایک گھنے جنگل میں تھا۔ رات کا وقت تھا۔ میں بے انتہا تھک گیا تھا۔ اور اب یہ خیال آیا کہ رات کہاں اور کیسے بسر ہو گی۔ راستہ یاد نہ تھا اور یاد بھی کیسے ہوتا، جنگل میں سوائے درختوں اور جھاڑوں کے اور کچھ نہ تھا۔ اس لیے میں جس طرف سے گیا تھا اُسی طرف سے واپسی ناممکن تھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔ پیاس شدت سے لگی تھی اور دل چاہتا تھا کہ ذرا دیر لیٹ کر آرام کروں لیکن پریشانی میں کوئی بات بن نہ پڑی۔ سونے میں صحرائی جانوروں کا خطرہ تھا۔ اسی پریشانی میں آہستہ آہستہ چلا جاتا تھا کہ میں نے بہت دور پر پھر اُس نوجوان کو جاتے دیکھا اور اس اُمید پر کہ شاید اس کی مدد سے پانی مل سکے میں نے گھوڑا تیزی سے دوڑایا۔ اُسنے بھی اپنا گھوڑا تیز کیا اور چند منٹ میں پھر نظروں سے غائب ہو گیا۔

میں بالکل مایوس ہو گیا اور سمجھ گیا کہ رات اسی عالم میں بسر ہو گی۔ گھوڑا پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا اور میں نے لگام ہاتھ سے چھوڑ دی کہ جدھر چاہے لیجائے۔ اس حالت کو بھی عرصہ گزر گیا اور پیاس کے مارے میرا دم نکلنے لگا۔ شاید رات کے دو بجے ہونگے کہ میں نے بہت دور پر ایک جانور کو کھڑے دیکھا۔ میں پہلے تو یہ سمجھا کہ شاید وہ کوئی صحرائی جانور ہوگا لیکن قریب جانے پر معلوم ہوا کہ گھوڑا ہے اور زین اس پر

بندھا ہوا ہے۔ اب کسی قدر ہمت بڑھی اور میں نے ادھر اُدھر تلاش شروع کی کہ ضرور اسکا مالک بھی قریب ہی ہوگا۔ یہ گھوڑا وہی تھا جس پر وہ نوجوان جسکو میں تلاش کر رہا تھا سوار ہو کر بھاگا تھا۔

تھوڑی دیر تک تلاش جاری رہی یکایک جنگل کے ایک بہت گھنے حصے میں ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا جو پتھر کا بے ڈھنگا سا بنا ہوا تھا۔ لیکن بہت مضبوط تھا۔ میں بیتابی سے مکان کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچکر دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ میں بلا کسی خوف کے اندر چلا گیا۔

مکان کے اندر عمارت بہت مختصر تھی۔ ایک دالان تھا اور ایک کوٹھری۔ صحن میں ایک بڈھا زانو پر سر رکھے بیٹھا تھا اور اسکے پاس ایک شخص چادر اوڑھے لیٹا تھا۔

میں نے بڈھے سے پانی کا سوال کیا لیکن شاید اُس نے نہیں سنا۔ میں اور اُسکے قریب گیا اور شانہ ہلا کر پانی مانگا۔ بڈھے نے سر اُٹھایا اور ایک سمت کو اشارہ کیا۔ میں اُس طرف گیا۔ دو گھڑے پانی سے بھرے رکھے تھے۔ میں نے پانی پیا اور پھر بڈھے کے پاس واپس آیا۔ بڈھے نے پھر اسی انداز سے سر جھکا لیا تھا۔ میں اُسکے قریب چٹائی پر بیٹھ گیا اور اُس کا انتظار کرنے لگا کہ وہ سر اُٹھائے تو گفتگو کروں۔ لیکن جب تھوڑی دیر گزر گئی تو میں نے پھر اُس کو مخاطب کیا۔ بڈھے نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ میں نے مختصر الفاظ میں تمام واقعہ کہہ سنایا!

میری باتیں سُن کر بڈھے نے ایک پُر درد آہ کھینچی اور کہا کہ "تم ہی میرے بیٹے کے قاتل ہو" یہ کہکر اُس نے چادر کی طرف اشارہ کیا اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔

میں متحیر تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ اور میں اسکے بیٹے کا قاتل کیسے ہو گیا۔ میں نے جلدی سے بڈھے کے مُنہ پر پانی چھڑکا اور دامن سے ہوا دینے لگا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ میں اُسے ہوش آیا۔ میرے دل میں خلش تھی کہ واقعہ معلوم کروں لیکن اس خیال سے کہ وہ بہت کمزور ہے میں خاموش رہا۔

آخر کار بڈھے نے کہا "ہاں تم نے میرے بیٹے کو قتل کیا ہے"

میں نے کہا "میں نے تو کسی کو بھی نہیں مارا" اُس نے پھر چادر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اُٹھ کر چادر اُلٹی تو دیکھا کہ اسکے نیچے اُسی نوجوان کی لاش رکھی ہوئی ہے جسکا میں تعاقب کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا کہ یہ موت کیسے واقع ہوئی؟ بڈھا بولا "یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ لیکن کچھ دیر

ہوئی کہ گھوڑا خالی واپس آیا تو مجھے بہت تشویش ہوئی اور میں خود اس پر سوار ہو کر لڑکے کی تلاش میں نکلا۔ میل بھر کے فاصلے پر جو نالہ ہے اسکے اس طرف لڑکا گرا ہوا ملا۔ کچھ جان باقی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمہارے خوف سے اس نے گھوڑے سمیت جست کی لیکن سنبھل نہ سکا۔ گرا اور چوٹ کھائی۔ میں اسکے قریب بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں میرا اکلوتا بیٹا مجھکو اس دنیا میں ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ کر جنت کو سدھارا۔" بڈھے نے پھر ایک آہ بھری جس سے میرا دل پاش پاش ہو گیا۔

میں نے لڑکے کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض کا پتہ نہ تھا۔ قلب پر ہاتھ رکھا اسکی حرکت بھی بالکل بند تھی۔

میں بہت شرمندہ تھا کہ میری وجہ سے ایک نوجوان کی جان مفت میں گئی۔ میں نے بڈھے سے کہا "نہیں نہیں معذرت کی کوئی ضرورت نہیں میرا کیا میرے سامنے آیا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب غور سے سنو۔ میں بھی اب تھوڑی دیر کا مہمان ہوں۔

بڈھا بولا۔ "تم نے شہباز کا نام تو سنا ہی ہوگا"

میں نے کہا "کون شہباز؟ ڈاکو؟"

بڈھے نے کہا "ہاں۔ میں وہی شہباز ہوں جسکے نام سے زمانہ تھراتا تھا"

"سنو۔ جب میں بچہ تھا اور میری عمر تین چار سال سے زیادہ کی نہ تھی۔ مجھے خواب سا یاد ہے کہ میں اپنے عزیزوں کے ساتھ جا رہا تھا کہ یکایک سامنے سے پچاس ساٹھ ڈاکوؤں کا ایک گروہ نمودار ہوا۔ انکے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ہتھیار تھے۔ انھوں نے قافلہ کو لوٹنا شروع کیا۔ قافلہ میں بہت سے مرد تھے۔ انھوں نے مقابلہ کیا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ ڈاکوؤں کے بھی دو تین آدمی مارے گئے۔ اور کئی زخمی ہوئے۔ قافلے والے گو بہت بہادری سے لڑے لیکن بہت سے مارے گئے۔ انھیں میں میرے والد مرحوم بھی تھے جو بچ گئے تھے مگر زخمی تھے۔ انکو بھی ڈاکوؤں نے گولی مار دی اور سب کو ایک گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔

عورتوں میں یاد نہیں کہ کتنی تھیں۔ وہ سب مال و اسباب کے ساتھ تقسیم کر دی گئیں۔ میری والدہ اور میں ڈاکوؤں کے سردار کے حصہ میں آئے۔

میری والدہ جو بہت امیر گھرانے کی تھیں۔ اور میرے والد کے گھر میں نہایت آرام سے رہتی تھیں۔ اب ڈاکوؤں کے سردار کے گھر میں ماماؤں کی طرح رہنے لگیں۔ انکو کھانا پکانا پڑتا تھا جھاڑو دینا ہوتی تھی اور برتن وغیرہ صاف کرنا ہوتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ اکثر رات کو چپکے چپکے اپنی حالت اور اپنے خاندان کی تباہی پر روتی تھیں اور اپنی موت کی دعائیں مانگتی تھیں کہ کسی طرح اس ذلت کی زندگی سے

نجات ملے۔

سردار اسی گھر میں رہتا تھا۔ گھر میں سردار اور اسکی بیوی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ انکے یہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ لیکن میرے آنے کے کچھ دن بعد اُن کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی، جسکا نام منیرا رکھا گیا۔ زمانہ گزرتا گیا۔ یہاں تک سردار کی لڑکی اس قابل ہوئی کہ چلنے پھرنے لگی۔ اور چونکہ اس جنگل میں اور کوئی نہ تھا اسلیے وہی میری رفیق ہوئی۔ میں زیادہ تر اُسی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔

اس وقت میری عمر بارہ تیرہ برس کی تھی، منیرا کی عمر چھ سات سال کی تھی۔ ایکدن ہم دونوں اس نالے کے قریب جسکو بہانے تت میرے بچپے کی جان گئی، بیٹھے کھیل رہے تھے کہ ایک سانپ نکلا اور ہماری طرف بڑھا میں نے جلدی سے ایک لکڑی کا ڈنڈا اُٹھا کر کوٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ مر گیا۔

میں اور منیرا گھر واپس آئے۔ منیرا نے اپنے والدین سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ سردار اور اسکی بیوی دونوں نے جاکر سانپ کو دیکھا، میری بہادری کا اعتراف کیا اور میرے بڑے شکرگزار ہوئے۔

میری زندگی میں پھر ایک خفیف تغیر ہوا۔ اب تک میں گھر میں ایک نوکر کی حیثیت سے رہتا تھا۔ لیکن اس واقعہ کے بعد سے میری خاطر مدارات ہونے لگی اور سردار مجھکو اپنا بیٹا کہکر پکارنے لگا، اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو میرا اُستاد مقرر کیا جس کا کام یہ تھا کہ مجھے شہسواری اور ہتھیار چلانا سکھائے۔ مجھے خود بھی ان چیزوں کا شوق تھا۔ میں نے بہت جلد یہ فن سیکھ لیے۔

سردار اکثر گھر سے غائب رہتا تھا اور دھڑا دھڑ ڈاکے ڈالا کرتا تھا۔ جب میں سترہ اٹھارہ برس کا ہوا تو پہلی مرتبہ ڈاکہ زنی میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ ایک مرتبہ جب وہ ڈاکہ مارنے جا رہا تھا تو اُس نے ایک عمدہ گھوڑا مجھے دیا اور میں ہتھیار لیکر اُس کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے مظلوموں کی چیخ پکار سے بہت تکلیف ہوئی۔ اور میں نے سردار سے خواہش کی کہ مجھے ان موقعوں پر نہ بیجایا کرے۔ سردار نے ہنس کر جواب دیا کہ "تم کسی کو مارو پیٹو نہیں، محض میرے ساتھ رہا کرو۔"

میں برابر اُس کے ہمراہ جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرا دل بہت سخت ہوگیا اور لوٹ مار میں مجھے لطف آنے لگا اور میں شوق سے ڈاکہ زنی میں شریک ہونے لگا۔

میری والدہ اکثر چپکے چپکے مجھے نصیحت کرتی تھیں کہ میں اس کام میں شریک نہ ہوا کروں۔ لیکن خاموش گھر میں بڑے بڑے

میرا دم گھبراتا تھا۔ ہاں اگر گھر میں دل لگتا تھا تو منیرؔ کی باتوں میں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اُسکے ساتھ مجھے سچی محبت تھی۔

ایک دن جبکہ میں عرصہ سے کسی ڈاکے میں شریک نہیں ہوا تھا، میری والدہ رات میں میرے پاس آئیں۔ انکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں انکو روتے دیکھنے کا عادی تھا، لیکن اُس دن وہ بہت ہی زیادہ اُداس تھیں۔ میں نے اُن سے اُداسی کا سبب پوچھا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ کیا گھر کی بربادی، تمھارے والد اور دیگر عزیزوں کی ناگہانی موت، تمھاری یتیمی، اپنی بے بسی اور یہ روز روز کی ذلت ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ انسان کے دل پر اثر ہو"؟

میں نے اقرار کیا کہ بے شک یہ چیزیں قابل افسوس ہیں۔ اسکے بعد والدہ نے کہا کہ آج میں نے سردار اور اُسکی بیوی کو یہ ذکر کرتے سنا ہے کہ تمھاری شادی منیرؔ کے ساتھ کردی جائے۔ لیکن میں تم کو تمھارے مرحوم باپ کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ خبردار منیرؔ کے ساتھ شادی نہ کرنا۔ تم ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ ہو، ہرگز ہرگز اپنی نسل خراب کرنا۔ اور جس قدر جلد ہوسکے اس جنگل سے بھاگنے کی کوشش کرو۔

میں نے والدہ کی تسلی کے لیے اُن سے وعدہ تو کر لیا۔ لیکن منیرؔ سے مجھے معمولی محبت نہیں بلکہ عشق تھا۔ اس لیے دل میں یہ خواہش تھی کہ خدا کرے شادی ہو جائے"۔

بڈھا تھک گیا تھا۔ اور ذرا دم لیکر اور ایک سرد آہ کھینچ کر اُس نے اپنا افسانہ پھر شروع کیا۔

"والدہ کے چہرے پر میں نے کبھی ہنسی نہیں دیکھی تھی۔ اُنکو اپنی اور اپنے خاندان والوں کی تباہی کا ایسا صدمہ تھا کہ اس غم نے رفتہ رفتہ اُنکے دل و دماغ پر اثر کرنا شروع کیا تھا۔ وہ بیمار ہوئیں اور کچھ دن بیمار رہکر وفات پاگئیں۔ مرتے وقت پھر مجھسے وعدہ لیا کہ میں منیرؔ کے ساتھ شادی نہ کروں گا۔

مجھکو والدہ کے مرنے کا بڑا صدمہ تھا۔ کئی دن تک تو مجھسے کچھ کھایا پیا نہیں گیا لیکن جس خلوص سے منیرؔ نے میرے ساتھ ہمدردی کی وہ میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ اتنی ہمدردی نہ کرتی تو میں سردار سے بالکل متنفر اور اس زندگی سے دل برداشتہ ہو گیا ہوتا۔

رفتہ رفتہ والدہ کا غم فراموش ہونے لگا میں سیر و شکار اور ڈاکہ زنی سے دل بہلاتا، اور جب گھر پر رہتا تو منیرؔ کی باتوں سے۔

کچھ زمانہ اور گزرا۔ ایک دن ہم سب یعنے ... اُس کی بیوی اور منیرؔ اور سردار کا ایک ساتھی سب مل کر ایک گاڑی میں سوار ہو کر ایک سمت

چلے - مجھے معلوم نہ تھا کہ ہم کہاں اور کیوں جا رہے ہیں - سفر بہت طویل اور دشوار تھا - ہم سب نے اپنی وضع تبدیل کرلی تھی - اور کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ ہم لوگ سیدھے سادے امن پسند دیہات کے باشندے نہیں ہیں -

راستہ میں منیرا نے مجھے بتایا کہ ہم لوگ گاؤں کو جا رہے ہیں جہاں میرے اور تمہارے تعلقات ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو جائینگے اور میں تمہاری اور تم میرے ہو جاؤ گے - والدہ مرحومہ کی نصیحت پھر یاد آئی لیکن میں منیرا کی جدائی کسی طرح گوارا نہ کر سکتا تھا - اس لیے خاموش ہو رہا -

شادی ہوئی، ہم لوگ اپنے گھر واپس آئے اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے - میری زندگی مسرتوں سے لبریز تھی - کوئی غم کوئی رنج نہ تھا لیکن چند سال کے بعد سردار کے ایک موقعہ پر گولی لگی - وہ زخمی ہوا - اُس کے رفقا اُسے گھر پہونچا گئے - میں نے حتی الامکان اس کی خدمت کی - وہ کئی دن بیمار رہا - اس خوف سے کہ کہیں کوئی پہچان نہ لے اسکو شہر بھیجا کر علاج کرنا مناسب نہ تھا - اور وہ خود بھی شہر میں جانا نہ چاہتا تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دن بیمار رہ کر وہ مر گیا -

سردار کے مرنے پر تمام ڈاکو جمع ہوئے انکو دفن کیا - اسکے بعد انھوں نے مجھکو اپنا سردار تسلیم کیا - وفاداری کی قسمیں کھائیں، اور آخری دم تک ساتھ دینے کا عہد و پیمان کیا - مجھے اور منیرا اور اُسکی ماں کو صبر کی نصیحت کی اور اپنے اپنے مقام کو چلے گئے -

"میرا دل سخت تو ضرور ہو گیا تھا اور کُشت و خون میں مجھے لطف بھی آنے لگا تھا لیکن والدہ مرحومہ کی نصیحت کا کبھی کبھی خیال آتا تھا - اور میں اس پیشہ سے تائب ہونا چاہتا تھا - لیکن مشکل یہ تھی کہ اگر میں ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑتا تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑتے - منیرا بھی میرے ہمخیال تھی - لیکن ہم دونوں مجبور تھے -

کچھ عرصے کے بعد منیرا کی ماں نے بھی وفات پائی اور ہم دونوں میاں بیوی تنہا رہ گئے - میری عمر اسوقت پینتیس کے قریب تھی - شادی کو کئی سال ہو چکے تھے لیکن اولاد کی نعمت سے ہم اب تک محروم تھے - لیکن کچھ زمانہ کے بعد منیرا کو حمل رہا اور میرے ہاں یہ لڑکا جسکی لاش تمھارے سامنے پڑی ہے پیدا ہوا"

بڈھے پر پھر ضعف کا غلبہ ہوا - اُس نے گھڑے سے لیکر پانی پیا - پھر ایک آہ سرد کھینچی اور بولا

"میں اب بچ نہیں سکتا - قلب کی حالت بدتر ہوتی جاتی ہے - اور مجھے بھی اب زندگی کی کوئی تمنا نہیں - سنو - ورنہ یہ واقعہ تمھارے

لیے راز ہی رہ جائیگا۔

اس لڑکے کی پیدائش کے وقت سے منیرہ کو بخار رہنے لگا۔ اور پندرہ سولہ دن کی بیماری کے بعد اُس نے وفات پائی۔

میرے لیے اب دو مصیبتیں تھیں۔ ایک منیرہ کی جدائی، دوسرے بچے کی پرورش۔ میرے ساتھیوں نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر بچے کی جان بچانا ہے تو فوراً دوسری شادی کرلینا چاہیے۔ لیکن میں نے منیرہ کے بعد کسی دوسری عورت سے شادی کرنے سے قطعی انکار کردیا۔

دوسری تجویز یہ پیش ہوئی کہ کوئی عورت مہیا کردی جائے جو اسکو پرورش کرے۔ لیکن یہ بھی مجھے منظور نہ تھا۔ کیونکہ اس میں افشائے راز کا اندیشہ تھا۔

آخرکار میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ میں خود ہی بچہ کی پرورش کرونگا۔ اور ڈاکوؤں سے کہدیا کہ بھائیو اب میرا دل دماغ اس قابل نہیں رہا کہ تمھارا ساتھ دے سکوں۔ اس لیے کسی اور کو اپنا سردار مقرر کرلو۔

اُنھوں نے میری حالت دیکھ کر اسے منظور کرلیا۔

اب میرا مقصد زندگی صرف اتنا تھا کہ منیرہ کی قبر پر بیٹھا رہتا اور اپنے بچہ کی پرورش کرتا۔ میں اس بچے کے لیے ——"

اور یہ کہتے ہوئے بڈھے نے لڑکے کی لاش پر نظر کی اور ایک دلخراش نعرہ مارا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں اپنے لخت جگر کی پرورش کرتا رہا۔ اسی زمانہ میں میرے خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی۔ ڈاکہ زنی سے تائب میں پیشتر ہی ہوچکا تھا۔ اب جو وقت مجھے ملتا اُس میں دوسروں کے ساتھ حتی الامکان بھلائی کرتا۔ اور منیرہ کی روح کو ثواب پہنچانے کی ہر امکانی کوشش کرتا۔ میرے بچے نے اپنی بے زبانی سے مجھے وہ تعلیم دی جو پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ اور اس مسکین نے میری زندگی کا سیاہ ورق پلٹ دیا۔

خیر وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ لڑکا جوان ہوا۔ وہ حسب معمول شہر سے جاکر ضروریات زندگی لے آتا تھا۔ آج بھی حسب معمول شہر گیا تھا وہاں اُس نے تم کو دیکھا اور اس خوف سے کہ کہیں تم کو میرا پتہ نہ مل جائے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ اور اس کا انجام یہ ہوا جو تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میرا مال و اسباب ان تہ خانوں میں پوشیدہ ہے۔ اب میں یہ تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ اس میں سے اگر دل چاہے تو میرے اور میرے بیٹے کے نام سے کسی نیک کام میں صرف کرنا ورنہ جس طرح چاہو اپنے کام میں لانا۔"

بڈھا پھر خاموش ہوگیا۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔

یکایک اُس نے اپنا مُنہ آسمان کی طرف بلند کیا اپنے گناہوں کا اعتراف کیا - انجام بخیر ہونے کی دعا مانگی، بیٹے کی لاش پر سے چادر کا کونا ہٹا کر اُس کے منہ پر بوسہ دیا اور اُس کے برابر لیٹ گیا - لبوں کو خفیف سی جنبش ہوئی اور دم نکل گیا -

صبح صادق کا وقت تھا - چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا - میں نے اُٹھ کر نماز صبح ادا کی - گھوڑے پر سوار ہو کر شہر میں آیا - وہاں سے تین چار آدمیوں کو بلا کر دونوں لاشوں کو برابر برابر دفن کیا - جتنا مال و اسباب تھا اُس سے میں نے ایک مسجد اور ایک سرائے تعمیر کرادی اور اُسکے متعلق جائداد وقف کردی جس سے مسجد اور سرائے کا خرچ چلتا ہے

نوائے ثاقب

جناب مرزا ثاقب قزلباش صاحب لکھنوی

عشق کہنے کے لیے منجملۂ اسرار ہے — چند باتیں تھیں، جنھیں کہنا بھی اب دشوار ہے
خواب میں ہیں وہ تو یوں اے دل تڑپتا جا یونہی — اُن کی قسمت کا ستارہ چرخ پر بیدار ہے
کروٹیں لیتی ہے دنیا آفریں اے دردِ دل — بوجھ میرا ہے مگر سارے جہاں پر بار ہے
فاصلہ سا مجھ میں اور اُن میں ہے پر کُھلتا نہیں — اُس سے میں بیزار ہوں یا مجھ سے وہ بیزار ہے
ایک چھوٹی سی حقیقت چشمِ گریاں ہے مگر — کون سے بادل کا ٹکڑا ہے کہ دریا بار ہے
ذرہ ذرہ سے عیاں ہے گردشِ تقدیرِ دل — ہر بگولا دشت میں میرا علم بردار ہے
موت وہ اچھی کہ جسکے بعد مل جائے حیات — جو سبب ہو موت کا وہ زندگی بیکار ہے
غیر ہیں پھر غیر، دل اپنا ہے، اس سے پوچھیے — کیا خطا کی تھی جو اب تک درپئے آزار ہے
بیچنے لایا تھا قبروں پر چراغِ سوزِ غم — کون لے گا روشنی سویا ہوا بازار ہے
اپنی حالت کے سوا کچھ بھی نظر آتا نہیں — جس کی صورت دیکھتا ہوں میں وہی بیمار ہے

آ ادھر ثاقب میں دیکھوں تو گریباں میں ہے کیا
طوقِ طاعت ہے کہ مخفی رشتۂ زنار ہے

ترکیب بند بر وفات عزیز

جناب ابوالکمال امید صاحب امیٹھوی

(۱)

اے زلیخائے سخن وے جانِ جانانِ سخن   گریہ کن ہاں گریہ بر مرگِ عزیزانِ سخن
آفتابِ تیرہ روز اکنوں شدہ ظلمت فروز   در خسوفِ مرگ آمد ماہِ کنعانِ سخن
با ہمہ سود اے غم اکنوں چہ کوتہ دستیش   تا بدامن چاک باید گریبانِ سخن
کے شود آئینہ دردِ دل بہ ماتم دیدگان   گر بتابوتش نہ بندی چشمِ حیرانِ سخن
لاجرم از خود بہ زندانِ خموشی شد اسیر   کاں عزیزے شد رہا از رنجِ زندانِ سخن
ایں کہ داند بے عزیزاں بر عزیزِ ما چہ رفت   بوئے خوں آمد بما لیکن ز دامانِ سخن
چوں عیاں بینم کہ کس را دل نمی سوزد بکس   بر مزارش گشتہ ام شمعِ شبستانِ سخن
گر سرِ غمخواریم داری دمے با من بساز   تا بجمعیت دہم زلفِ پریشانِ سخن
گر دلت بر جاست دہم طاقتِ دیدن کجاست   سینہ بشگافم نمایم داغِ پنہانِ سخن

بلبلِ دستاں سرائے گلکدہ از من برفت
فاش می گویم خدائے گلکدہ از من برفت

(۲)

از غمِ مرگِ عزیزاں آنچہ پیش آمد مرا   بر نمی تابد شنیدن گر بگویم برملا
چوں ہزار و سی صد و پنجاہ و چار آمد پدید   اندریں سالِ غم افزا داد ریناحسرتا
آں عزیزِ مصرِ شعر و شاعری یعنے عزیز   رہروِ ملکِ بقا شد زیں جہانِ بے بقا
شاہدِ اردو زباں را زیبد ار در ماتمش   سینہ کوبد گریہ و برہم زند زلفِ دوتا
آں عزیز با عزیزِ ہند و ہندم مصر بود   مصرِ ما شد بے عزیزِ مصرِ ما ماتم سرا
نشتر از مصراعِ خود اندر رگِ جاں میزنم   تا سرشکِ خوں چو فوارہ جہد از دیدہا
گریہ تکرارِ قوافی ساختم علیم مکن   امتیازِ ما و من از فرطِ غم باشد کرا

مصرعِ سالِ وفاتش گفت امید انچنیں
مصرِ ما زندانِ من شد بے عزیزِ مصرِ ما
۱۳۵۴ھ

قطعہ تاریخ ارتحال حضرت لسان الہند مولوی میرزا محمد ہادی عزیز مغفور

جناب مولانا عالم صاحب لکھنوی

سوئے ارم رواں شدہ از دارِ پُر محن — طودِ کمال و قلزمِ ذخارِ شاعری
زیبِ سریرِ ملکِ سخن شاہِ شہرِ نظم — کنز العلوم و طرّۂ دستارِ شاعری
عرشِ کمال و چرخِ فصاحت بلیغِ عصر — بودے بدہر مطلعِ انوارِ شاعری
بر رُو خورد طپانچہ زدستِ نہیبِ علم — حاسد گر از حسد کند انکارِ شاعری
آں بلبلے کہ نغمۂ او بے عدیل بود — رونق فزا و زیبِ چمن زارِ شاعری
غواصِ بحرِ نظم چو شد طبعِ انورش — آمد بدست گوہرِ شہوارِ شاعری
رنگیں نمود چہرۂ محبوبۂ غزل — شد خونِ قلب غازۂ رخسارِ شاعری
از صدقِ دل از ہمہ اقسامِ شعر گفت — اے آں تولی کہ واقفِ اسرارِ شاعری
در فنِ نظم داشت عزیز آں تخلصے — از ذاتِ اقدسش شدہ اظہارِ شاعری
افسوس جاں بحق شدہ آں زبدۂ جہاں — برباد رفت رونقِ دربارِ شاعری
ہاوقت آہ آہ ز عالم سفر نمود — سوئے بہشت مالکِ مختارِ شاعری

عالم نوشت مصرعِ ہجری ز خونِ دل
افسوس مُرد بلبلِ گلزارِ شاعری

۱۳۵۴ھ

(جناب سید ہادی صاحب ہادی لکھنوی)

ہائے وہ مرزا محمد ہادی والا صفات
جن کے دم سے تھی زمینِ شعر میں جلوہ گری
گُل ہوئی شمعِ حیات اُن کی ہوائے موت سے
یوں چلی بادِ فنا مانند بادِ صرصری
بادلِ غمناک ہادی نے لکھا یہ سالِ فوت
بجھ گیا خلوت گزیں مصباحِ بزمِ شاعری

۱۹۳۵ھ

قطعہ تاریخ وفات حضرت لسان الہند مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

جناب پروفیسر آغا آشہر صاحب لکھنوی ایم۔ اے

جس کو کہتے تھے سب لسان الہند — تھا جو اک پختہ کار فکر سخن
لکھنؤ تو نے کھو دیا اک لال — یعنی مرزا عزیز کامل فن
جام بردارِ ساقیِ کوثر — مدح پیرائے آل شاہ زمن
ضو فشاں شمعِ محفل آرائی — دلستاں نغمہ ریز بزم سخن
نہ ہوا کوئی تاجدارِ اودھ — تجھکو ملتا خطاب مستحسن
تیرا پیکر جو قابلِ خلعت — آج اُس کو پنہا دیا ہے کفن
اب کہاں خوابگہ بنائی ہے — اب کہاں ہے عزیز تیرا وطن
ہاں اُسی عالم خموشاں میں — جس کو غالب نے کر لیا مسکن
بن کے زلف سخن میں شانہ کش — کرکے نام کمال کو روشن
تو نے اُس خاک کو سنوار دیا — جس جگہ پر بنا ترا مدفن

لبِ آشہر سے نکلی یہ تاریخ
ہے جناں میں عزیز مصر سخن
۱۳۵۴

خون کے آنسو

(جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی)

کون اُٹھ گیا پہلو سے کہ نشتر رگ جاں ہے — دل درد ہے اور درد میں طوفان فغاں ہے
تاریک ہے دُنیا کوئی یہ تو بتا دے — وہ شمعِ شبستانِ کمالات کہاں ہے
اک نشتر سر تیز ہے یا حسرتِ دیدار — ارماں ہے کہ اک برق کلیجہ میں تپاں ہے
خاموش ہے محفل کہ عزیز آج نہیں ہے — چُپ چُپ سی فضائی ہے کہ گم حسن بیاں ہے
فریاد کہ اب طاقتِ فریاد نہیں ہے — پہلو میں مرے دل نہیں شعلہ ہے دھواں ہے
یہ تذکرۂ غم کہ لحد میں تجھے سونپ آئے — اک زہر میں ڈوبا ہوا نشتر ہے سناں ہے

افسوس ترے نام سے شہرت ہوئی ممتاز — اللہ! وہی تو ہے کہ بے نام و نشاں ہے
ہاں ہاں تجھے بہریِ عالم کے گلے تھے — اللہ قسم اب ترا مشتاق جہاں ہے
دنیا کی نگاہیں تجھے اب ڈھونڈ رہی ہیں — ہر آنکھ تری یاد میں خوننابہ فشاں ہے
اک درد کی تصویر تھا ہر حرف شکایت — اب تو ہے نہ وہ شکوۂ اربابِ جہاں ہے
سکے ہیں ترے نام کے خورشید و قمر میں — یہ بات کوئی کم ہے نہاں ہو کے عیاں ہے
آئینۂ حیرت ہے ترا پیکرِ خاموش — خاموشیِ تصویر میں بھی شان بیاں ہے
اب شکوۂ بہریِ گردوں نہ کریں گے — گنجینۂ اخلاق تو مٹی میں نہاں ہے
پھر ہوں گی منور ترے دیدار سے آنکھیں — دھوکا ہے، تخیل ہے، توہم ہے، گماں ہے
ہر ذرۂ خاموش ہے اک دفترِ فریاد — دل چاک ہے اس غم میں جگر نوحہ کناں ہے
مل جائیں عزیزؔ آپ تو آنکھوں میں چھپا لیں — افسوس مگر آج یہ امکان کہاں ہے

آشفتہ کسے ہوش، کسے اپنی خبر ہے
قابو میں نہ آنکھیں ہیں نہ دل ہے نہ زباں ہے

مٹتے جاتے ہیں جہاں سے گلستانِ شاعری

(جناب حافظ علی صاحب بیکسؔ بلگرامی)

کیوں نہ مٹ جائے بھلا اب اوجِ شانِ شاعری — مل چکا خاکِ لحد میں آسمانِ شاعری
کس طرح پھولے پھلے پھر گلستانِ شاعری — اٹھ گیا باغِ جہاں سے باغبانِ شاعری
خشک ہو جائے نہ کیوں علم و ہنر کی شاخ شاخ — خونِ دل سے کون سینچے گلستانِ شاعری
اٹھتے جاتے ہیں جہاں سے بلبلانِ خوشنوا — مٹتے جاتے ہیں جہاں سے گلستانِ شاعری
ہو چکے وہ ماہرِ فن ساکنِ خلدِ بریں — کہتی تھی دنیا جنھیں روحِ روانِ شاعری
اٹھتے جاتے ہیں جہاں سے مالکِ علم و ہنر — رہ گئیں کچھ صورتیں اب نوحہ خوانِ شاعری
آج کیسے سو رہے کنجِ لحد میں ہیں عزیزؔ — کل تو تھے دنیا میں یہ معجز بیانِ شاعری
چل بسے دنیا سے سچ پوچھو نہ کچھ تنہا عزیزؔ — ساتھ اپنے لے گئے گویا جہانِ شاعری

ہم کہاں اور پھر کہاں بیکسؔ عزیزِ نامور
گلکدہ[1] سے ہو گی ہاں اب یادِ شانِ شاعری

---

[1] "گلکدہ" مرحوم کا ایک مجموعۂ غزلیات ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ بیکسؔ

نظرے خوش گزرے

اگست نمبر کی خراب چھپائی کی بنا پر ستمبر نمبر کے لیے نیا اہتمام کیا گیا، مگر چونکہ ہمارے صوبہ میں میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انتخابات ہونے والے ہیں، مطبع کو رلے دہندوں کی فہرستوں نے مبتلا رکھا اور الناظر دو ہفتے سے زائد تاخیر کے بعد شایع ہوا۔ موقع پر موجود ہونے کی صورت میں شاید بروقت کچھ تدارک ممکن ہوتا، اب صرف دلی ندامت کے ساتھ عذرخواہی کی جا سکتی ہے۔ خدا کرے یہ پرچہ اسی ماہ کے اندر شایع ہو جائے اور آیندہ بدنظمی کا سلسلہ جاری نہ رہے۔

پرچہ کا حجم کم ہو، طباعت خراب ہو، یا اور صوری و معنوی نقائص رہ جائیں، بے وقت اشاعت کے مقابلہ میں یہ سب کچھ گوارا کیا جا سکتا ہے، مگر مہینے کے اندر اندر پرچہ شایع نہ ہو تو ناقابل بیان تکلیف ہوتی ہے۔

مولانا حالی مرحوم کی صد سالہ سالگرہ کا جشن اُنکے وطن پانی پت میں ۲۶ اور ۲۷ اکتوبر کو منایا جائے گا۔ اس اجتماع کا بڑا مقصد یہ ہے کہ حالی میموریل فنڈ کے لیے جس کی نگرانی میں "مرحوم کا قائم کردہ ہائی اسکول، متعدد ابتدائی مدارس، ایک علمی رسالہ اور ایک کتب خانہ چل رہا ہے" چندہ جمع کیا جائے۔ نواب صاحب بھوپال اس جشن کی صدارت فرمائیں گے اور امید ہے کہ اُن کی فیاضانہ امداد اور دیگر اکابر ملک کی اعانت و توجہ سے حالی فنڈ کے لیے اتنا سرمایہ فراہم ہو جائیگا کہ "آئے دن کی مالی پریشانیوں سے" نجات مل جائے۔

سفر میں ہونے کی بنا پر اس کی توقع نہیں کہ اس جشن میں شرکت کا موقع ملے گا، البتہ ایک امر کی طرف عقیدتمندان حالی و بہی خواہان اُردو کی توجہ منعطف کرانا شاید بے محل نہ ہو۔

حالی میموریل فنڈ کے ماتحت مدارس یا کتب خانہ کی حیثیت بالکل مقامی ہے۔ "علمی رسالہ" جسکا اپیل میں ذکر کیا گیا ہے اُس کی زیارت سے ہمیں محروم نہیں بلکہ اُسکے نام نامی سے بھی ہنوز ناواقف ہیں، اس لیے اُس کے متعلق اس بات کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں کہ وہ کس حد تک ایک مرکزی یادگار کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔ مولانا حالی کی خدمات پر نظر کی جائے تو وہ ساری قوم کے مخدوم تھے اور اس لیے اُن کی یادگار ایسی ہونی چاہیے کہ پانی پت یا اُسکے گرد و نواح کے علاوہ ہندوستان کے مختلف صوبوں

کے رہنے والوں کو بھی اُس سے تعلق، نفع یا دلچسپی ہو۔

ہمیں اپنا حال بخوبی معلوم ہے اس بنا پر نہ تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جشن کے سلسلے میں اتنا سرمایہ فراہم ہو جائے گا کہ مقامی اداروں کی امداد کے ساتھ ساتھ کوئی مرکزی یادگار قائم کی جائے اور نہ کوئی ایسی تجویز پیش کرنے کی ہمت پڑ سکتی ہے جسکے لیے صرف کثیر کی حاجت ہو۔ بلکہ ہماری تجویز حالات و توفقات کے لحاظ سے ایسی ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے میں زائد صرف نہ ہوگا اور کُل اہل ملک کو اس میں شرکت ہونے اور دلچسپی لینے کا پورا موقع رہے گا۔

مولانا حالی کی جو عظمت اہل ہند کے دلوں میں ہے وہ تمام تر اُن کی تصانیف نظم و نثر کے باعث ہے۔ مسدس حالی کو جو حسن قبول حاصل ہوا اُس کی بنا پر یہی نہیں کہ اُس کے سیکڑوں اڈیشن اب تک ملک کے مختلف حصوں میں شایع ہوے بلکہ اُس کی عمدہ طباعت میں بھی بعض کارخانوں نے خاص اہتمام کیا مگر افسوس ہے کہ اُن کی دیگر تصانیف اس قسم کے التفات سے محروم رہیں۔ حتیٰ کہ اس وقت بازار میں اُن کے دیوان کا کوئی اچھا اڈیشن ملے گا نہ اُن کے مجموعۂ نظم کا اور نہ اُن کی قابل قدر تصانیف نثر کا۔ اگر حالی میموریل فنڈ کے ارباب حل و عقد توجہ فرمائیں اور دس پندرہ ہزار روپیہ لگا کر جملہ تصانیف حالی کو دس پندرہ کیساں جلدوں میں دیدہ زیب طریقہ پر اور صحت کے ساتھ طبع کرائیں تو سارے اہل ملک اُس کی اشاعت میں حصہ لیکر مستفید ہو سکیں گے اور ممکن ہے کہ اس صورت سے خود حالی فنڈ کے لیے مستقل آمدنی کا ایک اچھا ذریعہ پیدا ہو جائے۔ یوروپ و امریکہ میں یہ طریقہ بہت عام ہے اور ایک ایک مصنف کی یادگار کی شاید سب سے اچھی صورت بھی یہی ہے کہ اُس کی کتابیں آنے والی نسلوں کے ردوبدل، تبدیل شدہ مذاق کے بموجب، بہتر سے بہتر حالت میں پیش کی جائیں۔ شکسپیر، اسکاٹ، میکالے، ٹمنی سن، وغیرہ کی تصانیف آج اسکولوں اور کالجوں کے تمام کتب خانوں میں اسی انداز سے موجود ہیں اور انگریزی زبان کی قدردانی کو دیکھ دیکھ کر حوصلہ مند ناشرین کتب آئے دن نئے نئے اڈیشن تیار کرتے رہتے ہیں، اور یہ تمام سلسلے بہت پسند کیے جاتے اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے ہیں تصانیف حالی کا ایک اڈیشن اس اہتمام سے شایع کر دیا جائے تو امید ہے کہ ہندوستان میں بھی یہ طریقہ مقبول ہوگا اور اس کی تقلید میں دوسرے اساتذۂ اُردو کی تصانیف کے سلسلے بھی شایع کیے جائیں گے۔

ہماری غیر حاضری کے زمانہ میں لکھنؤ کے بعض اہل قلم نے "اُردو اکیڈمی" کے نام سے ایک مجلس

قائم کی ہے جس کی شرکت کا مطبوعہ دعوت نامہ حیدرآباد میں ملا۔ اس قسم کے جتنے ادارے بھی بنائے جائیں اُنکا دلی خیر مقدم کرنا چاہیے بشرطیکہ علمی کام ہونے کی توقع ہو۔ محض انجمن سازی اشخاص متعلقہ کے لیے نفع بخش ہو تو ہو قوم و ملک کے لیے مختلف حیثیات سے موجب نقصان ثابت ہوئی ہے اس لیے جب تک لکھنؤ پہونچکر حالات کا پوری طرح علم نہ ہو جائے اُردو اکیڈمی کے متعلق ابھی کچھ عرض کرنا فضول ہے اور نہ اُس کی شرکت و عدم شرکت کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

برانہیں بے محل نہ ہوگا اگر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں ایک انجمن اُردو لکھنؤ میں قائم ہوئی تھی جس کا ذکر بارہا ان اوراق میں ہو چکا ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں جناب سید آل رضا صاحب ایڈوکیٹ اُس کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے، اُس وقت سے انجمن حالتِ تعطل میں ہے۔ انجمن اُردو کے پاس غالباً کچھ نقد سرمایہ، فرنیچر اور کتابیں بھی تھیں۔ ایسی صورت میں کسی نئے ادارہ کی بنا ڈالنے کے بجائے اگر اُسی کی ازسرنو تنظیم کر دی جاتی تو شاید زیادہ قرین مصلحت اور سودمند ہوتا۔

انجمن اُردو کا دستور العمل بڑی محنت اور مسلسل بحث و مباحثہ کے بعد تیار کیا گیا تھا اور اُس وقت لکھنؤ میں جتنے خدمت کرنے والے تھے اکثر و بیشتر اس انجمن سے وابستہ تھے۔ چنانچہ جب گورنمنٹ نے ہندوستانی اکیڈمی بنائی تو لکھنؤ کی نمائندگی کے لیے جو اراکین نامزد ہوئے وہ ایک کے سوا سب اسی انجمن سے تعلق رکھتے تھے۔ نئے ادارہ کے کارکن اگر اپنی سرگرمیوں کا مرکز انجمن اُردو کو بنا لیتے تو یہی نہیں کہ ابتدائی مراحل پر اُنکے قیمتی اوقات و توجہ کا ضیاع نہ ہوتا بلکہ انجمن کی شہرت، اُس کی روایات اور اُس کا مختصر اثاثہ بھی کام میں آجاتا۔ ممکن ہے کہ دستور العمل کے بعض اجزا مرورِ زمانہ سے اپنے کارکنوں کے مخصوص خیالات کی بنا پر ترمیم طلب ہوں تو دستور العمل میں اس کی پوری گنجایش موجود تھی کہ حسب ضرورت تبدیلیاں کر لی جائیں۔

اُردو اکیڈمی، اگرچہ جامعہ ملیہ کے تحت میں اب موجود ہے مگر ذاتی طور پر ہمیں یہ نام کبھی پسند نہیں ہے۔ قطع نظر اس کے کہ انجمن کے مقابلہ میں اکیڈمی زیادہ اجنبی اور بعید الفہم ہے، اگر معنوی حیثیت سے غور کیا جائے تو جدید ادارہ سے اغراض و مقاصد اور طریق کار کے لحاظ سے اکیڈمی کا محدود اصطلاح کے مقابلہ میں انجمن کا وسیع المعنی لفظ زیادہ موزوں اور جامع ہے۔ البتہ جدت پسند طبائع کے لیے اب یہ لفظ پُرانا اور فرسودہ ضرور ہو گیا ہے۔

خط و کتابت میں اپنا پتہ مکمل اور صاف لکھیے نیز نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجیے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔ منیجر

بنام خداوند جہاں آفریں

الناظر

نمبر ۵ جلد ۴۰ نومبر ۱۹۳۵ء

تباہی بنی اسرائیل

(جناب الحاج منشی امیر احمد علوی بی اے پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

سلطنت رومۃ الکبریٰ کے باج گزار بادشاہ کنعان ۔ ہیروڈ کے عہد میں یروشلم کے ایک "راست باز اور بے عیب" کاہن زکریا نام کو بڑھاپے میں اپنی سن رسیدہ بیوی سے ایک لڑکا عنایت ہوا جس کا نام اشارۂ غیب سے یوحنا (یحییٰ) رکھا گیا حالانکہ "اُن کے کنبے میں کسی کا یہ نام نہ تھا"۔ یہ لڑکا بڑا ہوا تو خدا کا کلام اُس پر اُترا" اور وہ "یردن کے سارے گرد و نواح میں گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کی منادی کرنے لگا"۔

یوحنا وہ اونٹ کے بالوں کا لباس پہنتا ۔ چمڑے کا پٹکا کمر سے باندھتا ۔ جنگلی شہد کھاتا اور منادی کرتا تھا کہ "میرے بعد وہ شخص آنے والا ہے جو مجھ سے زور آور ہے ۔ میں اس لایق نہیں کہ جھک کر اُس کی جوتیوں کا تسمہ کھولوں"۔ اُس زمانے میں ہیرودیس بن ہیروڈ گلیلی کا حاکم تھا اور اس نے اپنے بھائی فلپ کی بیوی ہیرودیاس سے تعلق پیدا کیا تھا ۔ مقدس یوحنا نے زجر و توبیخ کی ۔ بد اعمالیوں سے منع کیا ۔ حکومت کے نشہ میں ملامت کی ۔ مصلح بے ہنگام حاکم کو ناگوار ہوئی ۔ فساد اور بلوے کے خوف سے ناصح کو زندہ رہنے دیا لیکن محبس میں بند کیا ۔ ہیرودیاس اپنے عہد کی

جز نہیں تھی۔ وقت کی منتظر رہی۔ سالگرہ کے جشن میں اُس کی نوجوان بیٹی نے محفل میں ناچ کر بادشاہ کا دل خوش کیا اور تقسیم وعدہ لیا کہ "جو مانگے سو پاوے" قول و قرار کے بعد بولی کہ "یوحنا کا سر تھال میں یہیں مجھے منگوا دے"۔ بادشاہ غمگین ہوا مگر اپنی قسموں اور مہمانوں کے سبب اس نے حکم دیا کہ دے دیا جائے۔ آدمی بھیج کر قید خانہ میں یوحنا کا سر کٹوایا۔ اُس کا سر تھال میں لایا گیا اور لڑکی کو دیا گیا"۔

کہتے ہیں کہ یوحنا کے سر سے خون کا فوارہ جاری تھا جو اُس وقت تک بند نہیں ہوا جب تک شہر کی گلیاں محلوں۔ امیروں۔ رئیسوں اور عوام کے خون سے سیراب نہ ہوئیں۔ اور ایک بیش قیمت جان کے بدلے لاکھوں یہودیوں کا خون نہیں بہایا گیا۔

گلیلی میں اس خون ناحق سے ہیرودیس اور اُس کی ظالم بھاوج نے شہرت پائی یروشلم میں دوسرا اور اکابر نے دوسرا ظلم کیا۔ ہیرڈ کے آخری زمانہ میں یوحنا کی ولادت سے چند ماہ بعد حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تھے۔ یہودیوں نے ان پر مذہب میں رخنہ اندازی کرنے۔ آسمانی بادشاہت کی بشارتیں دینے اور حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے کا الزام لگا کر ۳۳ء میں عید کے دن گرفتار کر کے رومی گورنر پیلاطس کے سامنے سزا کے لیے پیش کیا۔ جرم کا ثبوت نہ تھا۔ گورنر نے تعزیر مناسب نہ سمجھی اور یہود سے کہا کہ تم اپنی شریعت کے موافق فیصلہ کرو مگر اکابر قوم مصر ہوئے کہ "صلیب دی جائے"۔

عیسیٰ[۱]

"پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا ہے اور بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ "میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب دیا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر .... تب یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا تا کہ صلیب دی جائے"۔

ان بے پناہ مظالم کی سزا قوم کو ملنا ضرور تھی۔ بنی اسرائیل ظلم و جور کا شکار ہوئے۔ فلسطین سے جلا وطن کیے گئے اور اُن کی تاریخ کا ورق چاک کر دیا گیا۔

پاداش بد اعمالی کے ظہور اور غضب خداوندی کے نزول کی ظاہری صورت یہ ہوئی کہ یہود نے

---

[۱] حضرت عیسیٰ کی ولادت ۴ قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ سنہ عیسوی جو اس وقت رائج ہے وہ مسیح کی ولادت سے نہیں شروع ہوتا بلکہ اسی سنہ کے آغاز سے ۴ ½ برس قبل حضرت عیسیٰ دنیا میں تشریف لا چکے تھے۔

رومتہ الکبریٰ کی حکومت سے بغاوت کی۔ وہ نازک مزاج اور جنگجو تھے۔ مذہبی امور میں کسی قسم کی مداخلت گوارا نہ کرتے تھے۔ ہر وقت بلوے اور فساد کے لیے تیار رہتے تھے۔ شہنشاہ کے حکم سے فلسطین کی مردم شماری ہوئی تو بلوہ کیا۔ شاہی جھنڈوں پر انسان کی تصویر نظر آئی تو گلا کٹانے پر تیار ہو گئے۔ آب رسانی کے لیے حوض بنانے کو ہیکل مقدس کے خزانے سے روپیہ لیا گیا تو فساد کیا۔ رومی گورنروں کو یروشلم میں امن قائم رکھنا دشوار تھا۔ فریسی۔ صدوقی۔ سامری وغیرہ فرقے باہم کشت و خون کرتے تھے اور جب حکومت کی طرف سے تشدد ہوتا تھا تو گورنر کو خطا کار ٹھہراتے تھے۔

سنہ ۶ء سے سنہ ۶۶ء تک ۶۰ برس میں ۱۴ گورنر تبدیل کیے گئے مگر کوئی حاکم سب فرقوں کو جو ایک دوسرے کو کافر اور مرتد سمجھتے تھے رضامند نہ رکھ سکتا تھا۔ آخری گورنر فلورس نے حقیقتاً سختی کا برتاؤ کیا اور ساری قوم کو ناراض کر دیا۔ مقابیوں کی کامیابیاں یاد آئیں اور یروشلم میں علی الاعلان بغاوت ہو گئی۔ سرکاری فوج کو زیر کیا۔ گورنر کا محل جلایا۔ حکومت کے موافقین قتل کیے اور شہر میں اپنا راج قائم کر دیا۔

بغاوت یہود

فلورس نے پہلے تو بغاوت کی آگ سلگنے دی تاکہ فساد اور خوں ریزی کے بعد فرقہ پرستی کا زور شروع ہو۔ حکومت کی مخالفت خانہ جنگی سے سرد پڑ جائے اور تب سرکشوں کو سخت سزائیں دے کر ہمیشہ کے لیے خود سری کا جنون یہود کے دماغ سے نکال دیا جائے۔

لیکن اتفاق سے جس دن یروشلم میں خود مختاری کا اعلان ہوا اُسی روز قیصریہ میں رومی گورنر کے حکم سے بیس ہزار یہودی قتل کیے گئے تھے۔ خبر برق کی طرح شہر میں پھیلی۔ یہود کے سب فرقے متحد ہو گئے اور ہر جگہ رومیوں کا قتل عام کرنے لگے۔ دار السلطنت سے سمندر کے ساحل تک بغاوت پھیلی اور بیشتر قلعوں پر یہود نے قبضہ کر لیا۔

جب پانی سر سے گزرا تو فلورس نے باغیوں کی سرکوبی کے لیے اپنے مستقر سے حرکت کی۔ یروشلم سے دو فرسخ کے فاصلے تک پہونچ گیا تھا اور شہر کے بزدلوں نے بھاگنے کی تیاری شروع کر دی تھی کہ بعض نامعلوم وجوہ سے وہ رات کی تاریکی میں سامان جنگ اور خیمہ و خرگاہ چھوڑ کر یکایک پسپا ہو گیا۔ یہودیوں کی ہمت بڑھی۔ اُنھوں نے تعاقب کیا اور تقریباً چھ ہزار رومی سپہ سالار قتل کر دیے۔ اس شکست سے افسردہ اور دل شکستہ ہو کر فلورس مر گیا۔ شہنشاہ نیرو نے ایک تجربہ کار سپہ سالار کو جو جرمنی اور برطانیہ میں داد شجاعت دے چکا تھا مشرقی حکومت کا مدار المہام بنایا۔ وسپیسین ایشیائے کوچک کے راستے سے شام آیا اور سنہ ۶۷ء کے موسم سرما میں ساٹھ ہزار

سپہ سالار روم

فوج لے کر گلیلی میں داخل ہو گیا۔ تیس برس پہلے اس صوبہ پر ہیرودس حکمراں تھا اور بے گناہ یوحنا کا خون ایک رقاصہ کو خوش کرنے کے لیے بہایا گیا تھا اب وہ خون رنگ لایا۔ باغیوں کی عملداری ہوئی اور رومیوں سے مقابلہ اور مجادلہ کے لیے یہاں کی حکومت جوزیفس کے سپرد کی گئی۔

جوزیفس

وہ جنگ میں شجاع سپاہی۔ مدبر جنرل۔ اور وفا شعار قوم پرست ثابت ہوا لیکن جس کارنامہ نے اس کی شہرت کو حیات جاوید عطا کی وہ اس کی بے نظیر "تاریخ یہود" ہے جو تباہی یروشلم کے کئی سال بعد اس نے رومتہ الکبریٰ میں تالیف کی تھی اور اس وقت تک احوال بنی اسرائیل کی جستجو کرنے والوں کے لیے مشعل ہدایت ہے۔ روما کی کارآزمودہ فوج سے کھلے میدان میں جنگ خلاف مصلحت سمجھ کر وہ "جوٹاپٹ" کے غیر معروف قصبہ میں قلعہ بند ہو گیا۔ یہ قصبہ ایک بلند چٹان پر آباد تھا جس کے چاروں طرف عمیق وادیاں تھیں اور ان کو اونچے پہاڑ اس طرح گھیرے ہوئے تھے کہ جب تک کوئی شخص وادیوں میں پہونچ نہ جائے وہ شہر کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ ویسپسین نے اس بستی پر قبضہ پانے کے لیے پوری فوجی قوت صرف کردی لیکن وہ کسی طرح وادیوں سے عبور نہ کرسکا مجبوراً

محاصرۂ جوٹاپٹ

اس نے بڑے بڑے متحرک پشتے تیار کرائے۔ تاکہ ان کی وساطت سے شہر کی دیواروں تک رسائی ہوسکے لیکن جوزیفس نے شہر کی دیواریں بلند کرانا شروع کیں۔

دیواروں کا بلند کرنا آسان نہ تھا کیونکہ چاروں طرف دشمن محاصرہ کیے تھے اور جو شخص دیوار پر نظر آتا تھا وہ تیر یا پتھر کا نشانہ بنتا تھا۔ اس کا توڑ یوں کیا گیا کہ بیلوں کی تازہ کھالیں دیوار سے لٹکائی گئیں تاکہ سنگ و سنان کو روک لیں یا کم از کم ان کی قوت کم کردیں اور آگ نیچے سے پھینکی جائے تو وہ کھالوں کی رطوبت سے ٹھنڈی ہو جائے۔

غرض بہزار مشکل دیواریں بلند کی گئیں۔ رومیوں کی ہمت پست ہوئی اور ان کے جنرل نے جنگی کارروائی ملتوی کردی۔ اس نے سوچا کہ چند روز میں یہود کے پاس سامان خوراک ختم ہو جائیگا اور اس وقت وہ خود امان کے طالب ہوں گے۔ محاصرے میں سختی کی گئی۔ شہر والوں کی آمدورفت کے سب راستے مسدود کر دیے گئے اور محصورین کو رسد کی تکلیف محسوس ہونے لگی۔ جوزیفس نے کئی دن تک شبانہ روز لڑائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہودی بے جگری سے لڑتے تھے اور رومیوں کو شکست ہوتی تھی۔ آخر کار دشمنوں کے متحرک پشتے تیار ہو گئے اور ان کی بلندی سے قلعہ کی دیوار پر پتھروں کی بارش شروع ہوئی۔ منجنیقوں کی سنگباری سے دیوار کا ایک حصہ کمزور ہو گیا۔ جوزیفس

نے ریت سے بھرے ہوئے تھیلے اُس مقام پر لٹکائے جہاں دیوار میں رخنے پڑ گئے تھے تاکہ پتھروں کا زور دیوار پر نہ پڑے مگر اسکے جواب میں رومیوں نے بانسوں میں کانٹے لگا کر تھیلوں کے رستے کاٹ دیئے۔ عاجز آکر یہودیوں نے دیوار سے کھولتا ہوا تیل اور دہکتی ہوئی آگ دشمنوں پر برسانا شروع کی۔ رومی سراسیمہ ہو کر دیوار کی زد سے دُور ہوئے اور منجنیقوں سے سنگباری مسلسل کرنے لگے۔ تمام رات بغیر کسی وقفے کے پتھروں کی بارش ہوتی تھی۔ دیوار کی حفاظت میں ہزاروں یہودی قتل اور زخمی ہوئے لیکن صبح ہوتے دیوار کا ایک حصہ گر گیا اور رومیوں کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ جوزیفس نے معذوروں اور بوڑھوں کو دیوار کے مضبوط حصے کی طرف تعینات کیا۔ عورتوں کو جو شور و غل کر رہی تھیں مکانوں میں بند کیا اور سب جوان و مضبوط سپاہیوں کو زرہیں پہنا کر شکستہ دیوار کے سامنے کھڑا کر دیا اور اُن کو ہدایت کی کہ جب رومی دستے دیوار کے نزدیک آجائیں تو اُن پر گرم تیل پھینکا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور رومیوں کو ایک مرتبہ پھر شہر سے پسپا ہونا پڑا۔ ویسپیسین نے پچاس پچاس فٹ اونچے لکڑی کے مینار بنوائے اور اُن پر لوہے کی چادریں جڑوائیں تاکہ آگ اُن پر اثر نہ کر سکے اور ان بلند میناروں کو سنگباری کے پشتوں پر کھڑا کر کے شہر میں تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ کر دی۔ یہود کے پاس اس کا کچھ جواب نہ تھا۔ وہ مجبور ہو کر شہر سے نکلے اور دشمنوں پر اس تیزی سے حملہ کیا کہ کچھ دیر کے لیے رومی فتح سے مایوس ہو گئے۔ ہزاروں یہودی اس کوشش میں بھی کام آئے۔ غرض ۴۷ دن تک محاصرے کی سختی قائم رہی اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن رومی شہر میں داخل نہ ہو سکے۔ تب ایک بزدل اور کم ہمت یہودی شہر والوں کی آنکھ بچا کر کسی طرح دشمن کے کیمپ میں پہنچا اور مخبری کی کہ شہر کی آبادی بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ کسی حملہ آور سے مقابلہ کا دم باقی نہیں ہے۔ رات کے آخری حصے میں سب سپاہی تھک کر سو جاتے ہیں اُس وقت دھاوا کیا جائے تو بغیر مزاحمت کے شہر پر قبضہ ہو جائیگا۔ ویسپیسین کو خیال تھا کہ کوئی یہودی اپنے ہمقوموں سے بیوفائی نہیں کر سکتا اور وہ اس مخبر کی روایت پر اعتماد نہ کرتا تھا لیکن افسروں کے مشورے سے مخبر کو نظر بند کر کے رات کے آخری حصہ میں شہر پر یکایک حملہ کر دیا گیا۔ سپہ سالار کا دست راست طیطوس پہلا شخص تھا جو ایک رومی دستہ لے کر شکستہ دیوار کے راستے شہر میں داخل ہوا۔ دیوار کی حفاظت کرنے والے حقیقتاً غافل تھے۔ اُنکو فوراً قتل کر دیا گیا اور بقیہ رومی فوج بھی داخل ہو گئی۔ دشمن شہر کے اندر تھا۔ قلعہ فتح ہو چکا تھا۔ سورج نکل آیا تھا لیکن شہر والوں کو خبر نہ تھی وہ ہنوز خواب خرگوش

میں تھے۔ بیشتر سوتے ہی مارے گئے۔ جو بیدار ہوئے وہ لڑکر قتل ہوئے۔ رومی محاصرے کی طوالت سے پریشان ہو چکے تھے۔ انھوں نے یہودیوں کو پکڑ پکڑ کر پہاڑ کے نیچے پھینکنا شروع کیا۔ بدحواسی پھیلی۔ یہود خود یہود کے ہاتھوں مارے گئے۔ ۴۰ ہزار مرد قتل ہوئے اور بارہ سو عورتیں اور بچے گرفتار ہوئے۔ شہر کی دیواریں مسمار کی گئیں۔ عمارتیں جلا کر خاک سیاہ کی گئیں۔ یہ واقعہ سنہ ۶۶ء مطابق سنہ ۱۳ جلوس شہنشاہ نیرو کا ہے۔

جوزیفس اس قتل عام سے بھاگ کر ایک غار میں چھپا اور چند روز کے بعد رومیوں کے لشکر میں طلب امان کے لیے حاضر ہوا۔ انھوں نے جان کی امان دی اور نظر بند کیا۔

جوپاپٹ کی تسخیر کے بعد سامریوں نے ایک پہاڑی پر مورچہ بندی کی۔ ان کے گیارہ ہزار چھ سو جوان مارے گئے۔ شہر قیصریہ یونانی باشندوں نے رومیوں کے حوالہ کر دیا۔ کل یہودی آبادی قتل کی گئی۔ طاریچا نے مقابلہ کیا۔ قتل عام ہوا۔ بہت سے باشندے ہلکی کشتیوں پر سوار ہو کر جھیل کے راستہ سے فرار ہوئے۔ رومیوں نے تعاقب کیا۔ بھاگنے والوں نے رومیوں پر پتھر پھینکے۔ ساحل پر دشمنوں کی فوج تھی۔ اس نے تیر برسائے۔ بعض بھاگنے والے برچھیوں کا نشانہ ہوئے۔ کچھ تلواروں سے مارے گئے۔ بعض کشتیاں دلدل میں پھنسیں اور کچھ غرق ہو گئیں۔ یہودی پانی سے سر نکالتے تھے تو تیروں کا نشانہ ہوتے تھے۔ دشمن کی کسی کشتی کا سہارا لیتے تھے تو ہاتھ کاٹ دیے جاتے تھے۔ بدحواس ہو کر خشکی کی طرف جاتے تھے تو تلوار سے سر کاٹا جاتا تھا۔ جھیل کا نیلا پانی خون سے سرخ ہو گیا۔ ساحل ٹوٹی ہوئی کشتیوں اور لاشوں سے پٹا تھا۔ چھ ہزار آدمی جھیل پر قتل ہوئے۔ بارہ سو بوڑھے اور کمزور شہر میں مارے گئے۔ چھ ہزار غلامی کے لیے یوروپ بھیجے گئے اور تیس ہزار بازاروں میں فروخت ہوئے۔
شہر گمالا کا چار مہینے محاصرہ رہا۔ ۹ ہزار یہودی قتل ہوئے۔ غرض صوبہ گلیلی کے تمام شہر یکے بعد دیگرے رومیوں کے قبضہ میں آ گئے اور اب سوائے یروشلم کے کوئی مقام باغیوں کے پاس نہ رہا۔

محاصرۂ یروشلم

یہود میں باہم اتفاق ہوتا تو دارالسلطنت کی تسخیر آسان نہ تھی مگر بدقسمتی سے شہر کے اندر مخالف فرقوں میں جنگ شروع ہو گئی اور اس کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا کہ سنہ ۷۰ء میں طیطوس[1] رومی نے محاصرہ کر لیا۔ اس وقت شہر میں تخمیناً دس لاکھ نفوس موجود تھے جن میں سے ۲۴ ہزار مستقل سپاہی تھے۔ رومی فوج اسی ہزار کے قریب تھی۔ یہود کو اپنے بیرونی بھائیوں سے امداد کی توقع

---

[1] سپہ سالار ویسپیسین سنہ ۶۹ء میں روم الکبریٰ کا قیصر ہو گیا تھا۔ وہ اٹالیہ چلا گیا اور فوج کی کمان اس کے بیٹے طیطوس کے ہاتھ آئی۔

تھی مگر طیطوس نے شہر کو اس طرح سب طرف سے گھیر لیا کہ نہ کوئی بستی کے اندر جا سکتا تھا اور نہ وہاں سے باہر نکل سکتا تھا۔ بیرونی فصیل دشمنوں کی سنگباری سے مسمار ہوگئی۔ یہودی شہر کے اندرونی حصے میں پناہ گزیں ہوئے۔ سامان خوراک کا ذخیرہ کافی نہ تھا۔ ایک مذہبی تیوہار کے سبب سے شہر کی آبادی اُس وقت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ گرانی شروع ہوئی اور لڑائی کی تکالیف کے ساتھ قحط کی مصیبت بھی سر پر آن پڑی۔ جوزیفس نے یہ دردناک داستان بڑے جوش وخروش سے بیان کی ہے اور اُسی کی زبان سے سننے کے قابل ہے :۔

قحط کی کہانی جوزیفس کی زبانی

”سامانِ خوراک کی کمی سے شہر والوں کا حال ایسا دردناک تھا کہ اُس کے تصور سے بھی آنکھیں تر ہوتی ہیں۔ سرداروں اور دولتمندوں کے پاس ضرورت سے زیادہ غذا موجود تھی مگر غربا اور کمزور فاقوں سے آہ و نالہ کرتے تھے۔ قحط کی مصیبت نے سب تعلقات فراموش کرا دیے تھے۔ شرم و حیا مفقود۔ خودداری اور عصمت نابود تھی۔ جو ہستیاں واجب الاحترام تھیں نفرت خیز ہوئیں۔ جن رشتہ داروں سے محبت تھی بیگانے سمجھے گئے۔ بچے اپنے باپ کے مُنہ سے آخری ریزہ چھیننے کو تیار رہتے تھے۔ مائیں خورد سال بچوں سے روٹی چھین کر کھاتی تھیں۔ عزیز ترین قرابت دار تڑپ تڑپ کر مر رہے تھے مگر پاس والوں کو اُن کے ہاتھ سے ایک قطرہ پانی چھین لینے میں تامل نہ تھا۔ اُس پر ستم یہ کہ باغی سپاہی گھر گھر تلاشی لیتے تھے۔ جو کچھ غربا نے چھین جھپٹ کر حاصل کیا وہ اُن سے لے جاتے تھے۔

جس دروازے کے کواڑ بند نظر آئے باغیوں نے سمجھا کہ گھر والے چھپا کر کھا رہے ہیں۔ مکان پر حملہ کیا۔ درندوں کی طرح کواڑ توڑے اور گھر میں گھس کر جو کچھ پایا اُڑا لے گئے۔ اگر کسی نے روٹی کا ٹکڑا منہ میں رکھا تو وہ زبردستی اُس کی حلق سے نکلوایا جاتا تھا۔

بوڑھے مرد روٹی چھپاتے تھے تو مارے جاتے تھے۔ عورتیں اجناس پوشیدہ کرتی تھیں تو اُن کے بال نوچے جاتے تھے۔ چھوٹے بچے اُلٹے لٹکائے جاتے تھے اور بے دردی سے فرش زمین پر پھینک دیے جاتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان باغیوں سے مزاحمت کرتا تو وہ قانون سے سرتابی کا ملزم تصور کیا جاتا اور سخت وحشیانہ سزاؤں کا مستوجب ہوتا تھا۔

پوشیدہ اجناس کے ذخیرے دریافت کرنے کے لیے باغیوں نے ہولناک طریقے ایجاد کیے تھے۔ بول و براز کے راستے مسدود کرتے اور ایسے ناقابل بیان شرمناک مظالم کرتے تھے کہ مالک مکان مجبوراً قبول کرتا تھا کہ اُسکے گھر میں روٹی کا ٹکڑا یا ایک مُٹھی جَو موجود ہیں۔

یہ مظالم اُس وقت ہو رہے تھے جبکہ سپاہی غذا کے محتاج نہ تھے۔ اگر ان کے پاس کھانے کو نہ ہوتا اور بھوک کی بے قراری میں وہ ایسے وحشیانہ حرکات کرتے تو اس قدر افسوسناک بات نہ تھی مگر واقعہ یہ تھا کہ فوج والوں کے پاس کھانا موجود تھا اور وہ غربا پر ظلم اس لیے کرتے تھے کہ اُن سے سامانِ غذا چھین کر آیندہ کے لیے جمع کریں۔

بعض غربا رات کے وقت شہر سے باہر نکل جاتے اور رومیوں کے لشکر کے قریب تک جاتے تھے کہ جنگل سے جڑی بوٹی جمع کر کے بچوں کے لیے لائیں۔ جب وہ اس خطرناک سفر سے واپس ہوتے تو ظالم باغی اُن سے بھی گھاس پھوس چھین لیتے تھے۔ وہ روتے چلاتے اور خوشامد کرتے کہ بچوں کے لیے کچھ رہنے دو۔ خدائے بزرگ کا واسطہ دلاتے مگر یہ ظالم ایک ریزہ بھی اُن کے پاس نہ چھوڑتے تھے۔ بدنصیب خدا کا شکر کرتے کہ سامان گیا تو گیا۔ ان درندوں سے جان بچی یہی لاکھ نعمت ہے۔

باغیوں کے مظالم کی تفصیل غیر ممکن ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جو مصیبت اس زمانہ میں شہر پر نازل ہوئی وہ ابتدائے آفرینشِ عالم سے کسی ملک میں نہ دیکھی گئی اور نہ سُنی گئی۔ کسی عہد میں ایسی بدکار نسل نہیں پیدا ہوئی جیسی کہ اس وقت یروشلم میں تھی۔ اس نے اپنی سیہ کاریوں اور بداعمالیوں سے عبرانی قوم کو ذلیل کیا اور اجنبیوں کی نگاہ میں ہمیشہ کے لیے اپنے بھائی بندوں کو خطاکار بنا دیا۔ طیطوس رومی کے فوجی دستے شہر پناہ کے قریب تھے۔ اُن پر فصیل سے سنگباری ہوتی تھی۔ سپہ سالار کو خبر ملی کہ شہر والے خوراک جمع کرنے کے لیے رات کے وقت بیرونی گھاٹیوں میں آتے ہیں۔ اُس نے ایک رسالہ کمین گاہ میں بٹھا دیا اور حکم دیا کہ جو یہودی شہر سے باہر نکلے وہ گرفتار کیا جائے۔

ان باہر نکلنے والوں میں لڑنے والے جوان بہت تھوڑے ہوتے تھے۔ زیادہ تعداد غریبوں کی تھی جن کو شہر میں کسی جگہ خوراک میسر نہ آتی تھی۔ وہ عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر شہر سے فرار نہ ہو سکتے تھے۔ اگر بیوی بچوں کو ساتھ لے کر بھاگتے تو حکومت سے بغاوت کے ملزم قرار دیے جاتے۔ گرفتار ہوتے اور قتل کیے جاتے۔ اور اگر اہل و عیال کو چھوڑ کر فرار ہوتے تو سب متعلقین موت کے گھاٹ اُتارے جاتے۔ قحط کی مصیبت میں زندگی سے بیزار ہو کر قوت لایموت کی جستجو میں باہر نکلتے تھے۔ ڈاکوؤں سے چھپ کر جاتے اور دشمنوں کے پنجے میں پھنستے تھے۔ رومی سپاہی اُن کا تعاقب کرتے اور وہ حفاظت خود اختیاری کے لیے جنگ پر مستعد ہوتے تھے۔ لڑنے کے بعد زخمی ہو کر رحم کی التجا بیکار تھی۔ وہ گرفتار کیے جاتے اور کوڑوں سے مارے جاتے تھے۔ جب ضربات سے ہلاک ہوتے تو شہر کے دروازے کے سامنے صلیب پر آویزاں کیے جاتے تھے۔ پانچ سو یہودی ایک ایک دن میں اس طرح صلیب پر لٹکائے گئے۔ طیطوس کو اُن کے حالِ زار پر رحم آیا لیکن وہ

مجبور تھا۔ اگر اس جماعت کو حراست میں رکھتا تو اُس کی فوج کا بڑا حصہ حفاظت پر مامور کیا جاتا اور جنگ میں کام نہ آسکتا۔ اسکے علاوہ ایک مصلحت بھی مضمر تھی کہ شہر کے باشندے یہ عبرتناک منظر دیکھ کر خوفزدہ ہوں اور اطاعت قبول کرلیں۔ رومی سپاہی روزانہ ان گرفتاران بلا کو لوہے کی سلاخوں سے صلیبوں پر چڑھاتے تھے یہاں تک کہ محبوسوں کے لیے شکنجے اور شکنجوں کے لیے میدان میں جگہ باقی نہ رہی۔

باغیوں پر اس مہیب کارروائی کا کچھ اثر نہ تھا۔ وہ مظلوم گرفتاروں کے اعزہ کو شہر کی دیوار پر لاتے اور یہ خونی منظر دکھا کر سمجھاتے تھے کہ ان لوگوں کو فصیل سے باہر نکلنے اور رومی حدود میں پناہ لینے کی سزا مل رہی ہے۔ کمزور دل والے یہ وحشیانہ سزا دیکھ کر دہل جاتے تھے اور شہر سے فرار ہونے کا خیال چھوڑ دیتے تھے مگر اہل ہمت پھر بھی باہر نکلتے اور کہتے تھے کہ قحط کی روزانہ تکلیف سے ایک دن کی موت بہتر ہے۔

طیطوس نے اس سفاکی سے تنگ آکر حکم دیا کہ آیندہ جو قیدی پکڑے جائیں اُنکو صلیب نہ دی جائے بلکہ اُنکے ہاتھ کاٹ کر شہرپناہ کے قریب چھوڑ دیا جائے اور اُن کی معرفت یروشلیم کے سرداروں کے پاس پیام بھیجا جائے کہ وہ اپنی حماقت سے باز آئیں اور رومیوں کو شہر کے تباہ کرنے پر مجبور نہ کریں تاکہ اُنکا خوبصورت دارالسلطنت اور مقدس عبادت خانہ بربادی سے محفوظ رہے۔ اسکے جواب میں باغیوں نے قیصر روم کو گالیاں دیں اور بآواز بلند اعلان کیا کہ وہ موت سے نہیں ڈرتے بلکہ غلامی کی زندگی پر مرگ کو ترجیح دیتے ہیں۔ شہرپناہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہیکل مقدس مسمار ہو تو کچھ خوف نہیں۔ تمام دنیا خدا کا عبادت خانہ ہے۔ آخری سانس تک وہ بزرگوں کی نشانی کی حفاظت کریں گے اور کسی شرط پر اطاعت منظور نہ کریں گے۔

اب یہودیوں کا شہر سے باہر نکلنا موقوف ہوگیا اور قحط کی سختیاں بڑھیں۔ ہر ایک قبیلہ اور خاندان پر خوراک کی قلت کا اثر ہوا۔

مکانات کی چھتوں پر عورتیں اور بچے جمع تھے جو بھوک کی تکالیف سے بدحال تھے۔ شہر کی گلیاں بڈھوں کی لاشوں سے پٹی ہوئی تھیں۔ جوان اور نوعمر لڑکے بازاروں میں بھوتوں کی طرح پھرتے تھے۔ اور جس جگہ طاقت جواب دیتی وہیں گر کر ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ ان لاشوں کی تجہیز و تکفین محال اور تدفین دشوار تھی۔ جو بیمار تھے وہ اس خدمت سے معذور۔ جو تندرست تھے وہ احتراز و انکار کرتے تھے۔ بہت سے بندگان خدا دوسروں کو دفن کرتے وقت خود موت کا شکار ہوئے اور کچھ قبروں میں گر کر قبل از وقت دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان اموات پر نہ کوئی آہ وزاری کرتا تھا اور نہ

کسی گھر سے ماتم کی آواز آتی تھی - قحط کی مصیبت ہر غم سے زیادہ جگر دوز تھی - مرنے والے مردوں کو سوکھی ہوئی آنکھ اور کھلے ہوئے مُنہ سے دیکھتے تھے اور خوش تھے -

"تمام شہر میں سناٹا چھایا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دن کو بھیانک رات ہے - مصیبت پر مصیبت یہ کہ ڈاکو اور چور اس حالت میں بھی اپنے حرکات سے باز نہ تھے - وہ دروازوں کو توڑ کر مکانات میں داخل ہوتے اور بسا اوقات وہاں بجز لاشوں کے کچھ نہ پاتے تھے - اُن کو لاشوں سے کفن اُتارنے میں بھی باک نہ تھا - وہ برچھیوں بھالوں خنجروں اور تلواروں سے مردوں پر نشانہ بازی کی مشق کرتے تھے - اگر کوئی نیم جاں گھر میں ملا اور اُس نے عاجزی سے درخواست کی کہ اپنی تلوار سے اُسکا خاتمہ کر دیا جائے تو وہ استدعا کو ٹھکرا کر باہر نکل جاتے اور اُسکو بھوک کی تکلیف سے ہلاک ہونے کے لیے چھوڑ جاتے تھے - مظلومین ہیکل مقدس کی طرف اپنا مُنہ پھیرے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتے تھے - جب لاشوں کا تعفن شہر میں ناقابل برداشت ہوا تو باغیوں نے حکم دیا کہ بیت المال سے روپیہ خرچ کر کے ان لاشوں کی تدفین کی جائے - مگر مُردوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا اور لاشیں شہر پناہ کی دیوار سے گھاٹیوں میں پھینکی گئیں -

ایک دن طیطوس گشت کرتا ہوا ان گھاٹیوں کے قریب پہونچا - وہاں کا عبرتناک منظر دیکھ کر اور غلیظ تعفن سے بد حواس ہو کر آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا کہ "اے خدائے لایزال آپ شاہد ہیں کہ یہ فعل میرا نہیں ہے"

بہت سے یہودی مصائب سے عاجز آکر فصیل شہر سے کود پڑے بعض لڑائی کا بہانہ کر کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر شہر سے باہر نکلے اور رومیوں کے لشکر میں امان طلب کرتے ہوئے چلے گئے - وہاں تازہ آفت سے دوچار ہوئے یعنی بھوک کی بدحواسی میں رومیوں کے دسترخوان پر اس قدر کھایا کہ اُنکے معدے پھٹ گئے یا مہلک بیماریوں میں مبتلا ہوئے -

قحط کی مصیبت سے بڑھ کر ہولناک آفت یہ نازل ہوئی کہ رومیوں کے لشکر میں خبر پہونچ گئی کہ جو یہودی یروشلم سے فرار ہو کر آتے ہیں اُنکے پیٹ میں سونا بھرا ہوتا ہے یعنی شہر سے ہجرت کے وقت وہ ڈاکوؤں سے حفاظت کے لیے سونا اور اشرفیاں نگل لیتے ہیں - دشمن کے سپاہیوں نے مصیبت زدہ مہاجروں اور امان طلب کرنے والوں کے شکم چاک کرنا شروع کیے تاکہ اُن سے سونا نکالا جائے - ہزارہا نفوس ہلاک ہوئے - صرف ایک شب میں دو ہزار یہودیوں کے پیٹ پھاڑے گئے اور اسقدر کثیر مقدار سونے کی رومی کیمپ میں پہونچی کہ بارہ درہموں میں اتنا سونا بکنے لگا جتنا پہلے پچیس درہم میں

ملتا تھا۔

شہر پناہ کے باہر یہ آفت تھی اور شہر کے اندر باغی سرداروں نے رعایا کا لہو چوسنے کے بعد ہیکل مقدس کے خزانوں پر ہاتھ صاف کیا۔ مقدس ظروف گلوا کر چاندی سونا باہم تقسیم کرلیا۔ ہیکل کی دیگیں۔ رکابیاں اور سینیں وغیرہ جن کی روزانہ عبادت اور نیاز کے لیے ضرورت ہوتی تھی آپس میں بانٹ لیں۔ بادشاہوں نے جو قیمتی سامان نذر چڑھایا تھا اُس پر بھی تصرف کیا۔ ہیکل کی مقدس شراب اور روغن کے برتن بھی خالی کیے اور کہتے تھے کہ وہ خدا کے لیے اور ہیکل کی حفاظت کے لیے جنگ کرتے ہیں لہٰذا لڑائی کا خرچ بھی ہیکل کو برداشت کرنا چاہیے۔

اس مقام پر میں (جوزیفس) اپنا خیال ظاہر کرنے پر مجبور ہوں کہ اگر رومی اس شہر کو تباہ کرنے میں زیادہ تامل کرتے تو عجب نہ تھا کہ زمین پھٹ جاتی اور یروشلم والے اُس میں دھنس جاتے یا سیلاب آتا اور سب یہودی غرق ہو جاتے یا بجلی گرتی اور سب کے سب خاک سیاہ ہو جاتے۔ کیونکہ یہ بدکار نسل کفر و الحاد، فسق و فجور میں اُن سب قوموں سے فوق رکھتی تھی جو ازمنۂ گزشتہ میں ایسے آفات سے ہلاک کی گئی تھیں۔ حقیقتاً انھیں بدمعاشوں کی دیوانگی کا نتیجہ تھا کہ تمام قوم یہود تباہ اور برباد ہو گئی۔

میرے سامنے ایک شخص نے جو شہر کے دروازہ کے قریب تعینات تھا طیطوس سے بیان کیا کہ ماہ نیساں کی چودہ تاریخ (یعنی آغاز محاصرہ) سے تموز کی پہلی تک ایک لاکھ پندرہ ہزار آٹھ سو اسی لاشیں یہودیوں کی نکالی گئی تھیں۔ یہ تعداد اُن لاشوں کی تھی جنکے اُٹھانے کا خرچ بیت المال سے دیا گیا۔ اسکے علاوہ ہزاروں لاشیں رشتہ داروں نے اپنے صرف سے پھیکوائی تھیں۔ میرے سامنے کئی معتبر اشخاص نے کہا کہ کم سے کم چھ لاکھ غریبوں کی لاشیں فصیل سے پھینکی گئیں۔ اور کئی لاکھ گھروں میں بند تھیں کہ انکا اُٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ گرانی کا یہ حال تھا کہ ایک مٹھی گیہوں ایک مثقال میں ملتا تھا۔

محاصرہ کی سختی بڑھی اور باہر سے جڑی بوٹی لانا بھی مسدود ہوا تو مویشیوں کے گوبر اور سنڈاسوں کے غلیظ سے دانے چُن چُن کر کھانے لگے۔ پہلے جس غلاظت کا آنکھ سے دیکھنا ناگوار تھا وہ اب بے تکلف حلق سے اُتاری جاتی تھی۔ بھوک کی تکلیف سے سوکھی گھاس چباتے اور جوتیوں کا چمڑا کھاتے تھے۔ اگر کسی خوردنی شے کا سایہ بھی نظر آیا تو باہم کُشت و خون کی نوبت آتی تھی اور زبردست کمزور سے چھین کر کھا جاتا تھا۔

میں یہ شرمناک حرکات کیوں بیان کرتا ہوں؟ میں ایسا واقعہ لکھنے والا ہوں جس کی نظیر یونانیو

اور وحشیوں کی تاریخ میں بھی نہیں مل سکتی۔ مجھکو اس قصہ کے درج کرنے میں پس وپیش تھا کیونکہ آیندہ نسل شاید اس روایت کو غلط سمجھے لیکن اس وقت متعدد چشمدید گواہ اس حکایت کے موجود ہیں یعنے

اوراء اردن کی ایک شریف اور دولتمند عورت مریم نام عرصے سے یروشلم میں مقیم تھی۔ محاصرہ کے ایام میں اسکا اثاث البیت لٹ گیا۔ جو دولت اُس کے پاس تھی چھن گئی۔ کسی قسم کا اناج گھر میں باقی نہ رہا حتی کہ کواڑ تک ڈاکو اُتار لے گئے۔ وہ عورت سخت پریشان اور تباہ تھی۔ سپاہی روز اُس کے گھر میں گھسنے تھے اور جب کوئی شے نہ پاتے تو گالیاں دیکر واپس جاتے تھے۔ ایک دن بھوک سے جاں بلب ہوکر اُس نے دوزخ بھرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ اپنے شیرخوار بچے کو سوکھی چھاتی سے چھڑا کر کہا "اے بدنصیب لڑکے میں اس لڑائی کے وقت تجھ کو کس دن کے لیے زندہ رکھوں۔ اگر رومیوں نے قتل نہ کیا تو غلام بنائیں گے اور اُن کی غلامی کی ساعت آنے سے پہلے ہی قحط میرا اور تیرا خاتمہ کردے گا۔ شہر کے ڈاکو سپاہی غلامی اور قحط کی مصیبتوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ تو میری خوراک بن تاکہ یہ قصہ دنیا میں یادگار رہے اور یہودیوں کی مصیبت اور فلاکت عالم آشکارا ہو۔"

یہ کہکر اُس نے معصوم بچے کو ذبح کیا اور بھون کر نصف خود کھایا اور نصف چھپا رکھا۔ سپاہی گوشت کی بو پاکر مکان میں داخل ہوئے اور عورت کو دھمکانے ڈرانے لگے۔ عورت بولی کہ آج مجھکو نفیس گوشت دستیاب ہوا۔ آدھا میں نے کھالیا اور آدھا تمھارے لیے رکھا ہے۔" یہ کہکر اپنے بچے کے جسم کا بقیہ حصہ اُن کے سامنے پیش کیا۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر سپاہی بدحواس ہوئے اور ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ بہادر عورت بولی "یہ میرا ہی بیٹا ہے۔ میں نے ہی اس کو ذبح کیا ہے۔ آؤ اس میں سے کھاؤ۔ میں نے خود کھایا ہے۔ تم عورت سے زیادہ نرم دل اور ماں سے بڑھکر محبت کرنے والے نہیں ہو سکتے۔ اگر تم کو اس غذا کے استعمال میں پس وپیش ہے تو جاؤ۔ آدھا میں کھا چکی ہوں۔ یہ بقیہ بھی میرے ہی لیے رہنے دو۔" سپاہی خوف زدہ ہوکر مکان سے بھاگے اور گوشت بدنصیب ماں کے لیے چھوڑ گئے۔

یہ ہولناک واقعہ تمام شہر میں مشہور ہوا۔ ہر شخص کانپ اُٹھا۔ لوگ موت کی تمنا کرتے تھے کہ اس آفت سے نجات ملے۔ اور جو مرچکے اُن پر رشک کیا جاتا تھا کہ وہ آرام کی جگہ پہونچ گئے۔ یہ المناک خبر رومیوں کے لشکر تک پہونچی۔ اکثر کو یقین نہ آیا۔ بعض غم واندوہ سے متاثر ہوئے اور بعض کو قوم یہود سے نفرت وعداوت پیدا ہوگئی۔ قیصر روم کو معلوم ہوا تو اُس نے اپنے خدا کے حضور میں معذرت کی اور کہنے لگا کہ میں نے یہودیوں کو امن وآزادی کی دعوت دی تھی مگر انھوں نے بغاوت کو پسند کیا اور

اپنی قوم کی بربادی کے خواہشمند ہوے - بچہ کا گوشت کھانا ایسا سنگین جرم ہے کہ اس کی پاداش میں اُن کی سب بستیاں اُجاڑنا چاہیے - ایسا شہر صفحۂ ہستی پر سورج کی روشنی میں باقی رہنے کا مستحق نہیں جہاں کی مائیں یہ ناپاک غذا کھاتی ہوں ۔"

اب اس کو یقین آگیا کہ یروشلیم کسی طرح اطاعت پر تیار نہ ہوگا اور ایسی سخت مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد وہاں کے رہنے والوں میں اتنی سلامتی حواس اور درستی عقل باقی ہی نہیں رہ سکتی کہ وہ اپنا نیک و بد سوچیں اور طالبِ امان ہوکر قحط کی آفت سے نجات پائیں -

---

تباہی یروشلیم

باوجود مصائب قحط کے جنگ زور شور سے جاری تھی - رومی دھاوے کرتے تھے اور پسپا ہوتے تھے - آخرکار رومیوں کے قلعہ شکن آلات نے ایک جگہ دیوار میں رخنہ کردیا - طیطوس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُس مقام پر قبضہ کریں - ۱۲ سپاہی بڑھے مگر وہ مغلوب ہوے - دو دن تک کسی کو پیش قدمی کی ہمت نہ ہوئی - رات کے وقت ۲۰ سپاہی اُس شگاف سے داخل ہوے اور شہر کے ایک محلہ پر قبضہ کرلیا - طیطوس نے امن کا اشتہار دیا اور باغیوں کے عفو تقصیر کا اعلان کیا - بعض نے اس رحم و کرم سے فائدہ اُٹھایا - مگر بیشتر صیہون اور ہیکل مقدس میں پناہ گزیں ہوے - طیطوس نے سرداران فوج سے مشورہ کیا کہ عبادت خانہ محفوظ رکھا جائے یا تباہ کردیا جائے - بیشتر جنرلوں کی راے تھی کہ وہ جلادیا جائے مگر طیطوس نے طے کیا کہ دھاوا کرکے یہودیوں کو خارج کیا جائے اور ہیکل کی خوبصورت عمارت مسمار نہ کی جائے - محاصرہ کی طوالت سے سپاہی مشتعل تھے ایک دل جلے نے جلتی ہوئی مشعل عمارت پر پھینک دی - شعلے بھڑک اُٹھے - یہودیوں نے یہ منظر دیکھ کر چیخ ماری اور تلواریں کھینچکر دشمنوں کو مارنے اور ہیکل پر اپنی جانیں قربان کرنے لگے - طیطوس فوراً موقع پر پہونچا - شور مچایا اور آگ بجھانے کا حکم دیا مگر تلواروں کی جھنکار میں اُس کی آواز کون سنتا - سپاہی برابر بڑھتے رہے - ہر شخص اندرونی حصہ میں داخل ہونے کی کوشش کرتا اور بے پناہ یہودیوں کو قتل کرتا تھا -

آج قوم یہود پر غضب خداوندی نازل تھا - ہزاروں بیگناہ قربان گاہ کے گرد کٹے ہوے پڑے تھے - ہیکل کی سیڑھیوں سے خون کے پرنالے بہہ رہے تھے اور لاشیں بہہ بہہ کر نیچے گرتی تھیں - قبل اسکے کہ ہیکل کے مقدس ترین مقام تک آگ کے شعلے پہونچیں طیطوس نے اُسکو بچانے کی کوشش کی مگر اُس کی آنکھوں کے سامنے مغلوب الغضب سپاہیوں نے الہام گاہ کے عالی شان

دروازے میں آگ لگادی اور ساری عمارت ایک ساعت میں جل کر خاک کا ڈھیر ہوگئی۔
اس طرح یروشلم کا خاتمہ ہوا اور جوزیفس کے تخمینہ کے مطابق گیارہ لاکھ یہودی مقدس شہر کی حفاظت میں قتل ہوئے۔
بعد ازاں الطاکیہ وغیرہ دوسرے مقامات پر تشدد شروع ہوا۔ یہودی جلائے جاتے تھے اور اُن پر وحشیانہ مظالم ہوتے تھے۔ طیطوس نے مزاحمت کی اور سپاہیوں سے جھڑک کر کہا کہ "یہود کا ملک تباہ ہوگیا۔ وہ اب یہاں واپس نہیں آسکتے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ دنیا میں کسی جگہ اُن کو امن نہ ملے۔
یہود کی تاریخ ختم ہوگئی۔ بنی اسرائیل کا من حیث القوم وجود باقی نہ رہا۔ کنعانی غلام یوروپ اور ایشیا کے بازاروں میں علی الاعلان فروخت ہوئے۔ ایک معمولی گھوڑے کے دام اور اُن بدنصیب غلاموں کی قیمت برابر تھی۔ یہودیوں کا ملک ریگستان ہوگیا۔ اور بھیڑیے اور درندے اُن شہروں میں رہنے لگے جہاں اسرائیلیوں نے عیاشی اور بدکرداری کی داد دی تھی۔

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

مسلم کا دورِ جمود

(جناب مولوی حاجی محمود حسن خاں صاحب محمود اسرائیلی)

ہم نشیں کچھ انقلابِ ہستیِ فانی بھی دیکھ
دیکھ لی بزمِ طرب اب اسکی ویرانی بھی دیکھ!

بخت و تدبیر رسا کی سخت طولانی بھی دیکھ
غیر کی فرزانگی اور اپنی نادانی بھی دیکھ

حسن کا سینہ تھا امینِ نکہتِ گلزارِ دہر
اس گلِ راحت چشیدہ کی پریشانی بھی دیکھ

عرش مسکن تھا کبھی جو لامکاں پرواز تھا
اُس سبک رفتار کی تو اب گراں جانی بھی دیکھ

گوشۂ داماں بنا تھا جن کا ستارِ عیوب
آج اُسکے جامۂ عصمت کی عریانی بھی دیکھ

جسکی ہستی تھی کبھی آئینہ دارِ رمزِ کُن
آج اس ننگِ جہاں کا نورِ ایمانی بھی دیکھ

جسکی رگ رگ میں کبھی برقِ عمل تھی موجزن
آج اُس سیماب پیکر کی تن آسانی بھی دیکھ

جو کبھی افلاک پر چمکا تھا بن کر مہرِ علم
تیرگیِ جہل کی اُس میں فراوانی بھی دیکھ

دیدۂ عبرت سے کر اقبالِ مسلم پر نگاہ
اور مری انجام بیں نظروں کی حیرانی بھی دیکھ

خود نوشت میرزا محمد خاں قزوینی

(جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے)

چہار مقالۂ عروضی کو قدیم فارسی ادب میں جو منزلت حاصل ہے وہی درجہ عجب نہیں جو آیندہ زمانہ میں بیست مقالۂ قزوینی کو حاصل ہو۔ ہمارے مکرم جناب مرزا محمد عسکری صاحب نے چاہا تھا کہ یہ کتاب بھی لباس اُردو سے آراستہ ہو جائے اور اسی خیال کی بنا پر نہایت ذوق و شوق سے اُس کا ترجمہ شروع کر دیا تھا، اور ایک ثلث کے قریب کام ہو چکا تھا کہ "کاپی رائٹ" کے جھگڑے کی وجہ سے قلم رُک گیا۔

مصنف نے مقالۂ اول میں مختصراً خود اپنے حالات تحریر کیے ہیں، جو مرزا صاحب کی عنایت سے درج الناظر کیے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ علم و ادب کے شایقین اس کے مطالعہ سے محظوظ ہوں گے۔ انشاء اللہ ترجمہ شدہ اوراق کے بعض دیگر اجزا بھی وقتاً فوقتاً نذر ناظرین ہونگے جن سے ان مقالات کی قدر و قیمت کا اندازہ اُن اصحاب کو بھی ہوگا جو اصل کتاب کے مطالعہ سے بہرہ مند نہیں ہو سکے۔

ایڈیٹر

تاریخ و جاے ولادت - ابتدائی تعلیم

بندہ کا نام محمد اور میرے والد کا نام عبد الوہاب بن عبد العلی قزوینی ہے۔ میرے والد "نامۂ دانشوراں" کے چار مولفوں میں سے ایک تھے۔ اور نحویوں اور اہل لغت اور ادبا و فقہا کے حالات جو اُس کتاب میں درج ہیں غالباً اُنھیں کے سپرد تھے۔ اُن کا نام اُس کتاب کے مقدمہ میں موجود ہے اور نیز اُنکے کچھ مختصر حالات مرحوم اعتماد السلطنت محمد حسن خاں کی "کتاب المآثر والآثار" میں بھی مذکور ہیں۔ میرے والد کا انتقال سنہ ۱۳۰۶ھ میں طہران میں ہوا۔ اور میری ولادت بھی طہران ہی میں محلۂ دروازۂ قزوین میں پندرھویں ماہ ربیع الاول سنہ ۱۲۹۴ھ کو ہوئی۔

اساتذہ کا ذکر

علوم متداولۂ اسلامی کی تحصیل اُسی طہران میں میں نے کی۔ صرف و نحو اپنے والد سے اور مرحوم آقائی حاجی سید مصطفےٰ [1] (جو قناعت آبادی کے لقب سے مشہور تھے) سے

---

۱ تقریباً سنہ ۱۳۴۰ھ میں یا کسی قدر کم و بیش وفات پائی۔

مدرسۂ معیر الممالک میں پڑھی، اور فقہ انھیں بزرگوار اور مرحوم حاجی شیخ محمد صادق طہرانی[1] مدرس مدرسۂ مذکور سے اور چند دن مرحوم حاجی شیخ فضل اللہ نوری[2] سے اور علم کلام اور حکمت قدیم آقائی حاجی شیخ علی نوری سے مدرسۂ خان مروی میں اور اصول فقہ مرحوم ملا محمد آملی[3] سے مدرسۂ خازن الملک میں اور اسکے بعد اصول فقہ خارجاً مرحوم آقا میرزا حسن آشتیانی[4] کی خدمت میں ان مرحوم کے آخری تین چار سال کی مدت میں حاصل کیے۔ ان بزرگ کا تبحر اور احاطۂ معلومات تمام جزئیات علم اصول میں واقعی حیرت انگیز تھا۔ مثل ان کے کم کوئی شخص اس واقفیت اور معلومات کا پیدا ہوا ہوگا ایک آدمی کسی ایک علم کے فروع و مسائل پر حاوی اور اتنا ذہین و طباع قیاس میں نہیں آسکتا۔

ادبیات عربی سے طبعی ذوق

میں نہیں کہہ سکتا کہ بچپن ہی سے ان تمام علوم متداولہ میں ادبیات عربی سے اس قدر شوق و ذوق مجھ کو کیوں تھا۔ بچپن اور شباب کا زیادہ تر زمانہ اسی فن کے مختلف شعبوں خصوصاً علم نحو میں صرف ہوا اور عمر گرانمایہ اسم و فعل و حرف کے شغل میں ختم ہوئی۔ اب بھی جب میں اُن گزشتہ ایام پر غور کرتا ہوں و تلف کی ہوئی عمر پر تاسف کرتا ہوں تو میری بہترین تفریحات اب بھی شرح رضی اور "مغنی اللبیب" ہیں جو میرے واسطے وصل حبیب سے بھی زیادہ خوشگوار اور مزیدار ہیں اور گویا عادت طبیعت ثانیہ ہوگئی ہے۔

اُن لوگوں کا ذکر جن سے بغیر درس و تدریس فیض حاصل کیا

اُن بزرگواروں میں کہ جنکی مبارک ذات سے بغیر درس و تدریس کتب رسمی کے میں نے اپنی استعداد کے بموجب کسب فیض کیا۔ مرحوم حاجی شیخ ہادی نجم آبادی ہیں[5]۔ قریب دو تین سال تک ہر روز غروب آفتاب کے بعد جب دو ایک گھنٹے گزر جاتے تھے اپنے ایک دوست کے ساتھ ان بزرگوار کی مجلس میں جبکہ یہ اپنے مکان کی بیرونی منزل حسن آباد میں ریگ و زمین پر بے فرش تشریف فرما ہوتے تھے میں حاضر ہوا کرتا تھا اور اس مقدس ہستی اور اُنکے اصحاب اور شاگردوں کی صحبت سے مستفید ہوتا تھا ......

---

[1] ناصر الدین شاہ کے آخری عہد یا مظفر الدین شاہ کے شروع عہد میں طہران میں وفات پائی۔

[2] ۱۳ رجب ۱۳۲۷ھ میں طہران میں پھانسی پائی۔

[3] تشکیل سلطنت موجودہ یعنی ۱۳۴۲ھ تک زندہ تھے۔ انکے بعد مجھکو نہیں معلوم کہ کس تاریخ وفات پائی۔

[4] مظفر الدین شاہ کے شروع عہد میں یعنی تقریباً ۱۳۱۶ھ میں طہران میں وفات پائی۔ انکے جنازہ پر تقریباً تمام اہل شہر یکسو تھے۔ تمام دکانیں اور بازار بند کردیے گئے تھے۔ اور وہ ایسا دن تھا کہ جو کبھی بھول نہیں سکتا۔

[5] مظفر الدین شاہ کے شروع عہد میں یعنی ۱۳۱۴ھ کے بعد طہران میں انتقال کیا۔

اُنکی زندگی کی سادگی، اُنکے خیالات کی صحیح معنوں میں آزادی، جو خدمت کہ ملک کی بیداری اور موہومات کے پردوں کو چاک کرتے میں اور اُس عہد کے لوگوں کی آنکھوں اور کانوں کے کھولنے میں اُنھوں نے انجام دی۔ اُن کی مجلس کی عجیب و غریب وضع اور مختلف مذاہب و ملل مسلمان و یہود و بابی وغیرہ کی اُس میں شرکت اور مختلف مسائل مذہبی پر اُنکے مباحث کمال آزادی کے ساتھ جس میں کبھی کبھی طنز و استہزا بھی اُن بزرگوار اور اُن کے اصحاب و تلامذہ کی شان میں شامل ہوتا تھا۔ اور جو احترام و بزرگی کہ اُنکے اصحاب اُنکے ساتھ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کوئی حرکت بلکہ مسکراہٹ بھی اُن کے سامنے نہیں آسکتی تھی۔ غرضکہ یہ سب امور اُس زمانہ کے عجائب و اقعات سے ہیں جو کبھی نہیں بھول سکتے اور جن کو مفصل بیان کرنے کے لیے ایک کتاب چاہیے۔ بہرحال اسکو ایک جملۂ معترضہ سمجھ کے میں آگے بڑھتا ہوں۔

دوسرے اُستاد معظم کہ جن کے افادات کثیرہ سے میں مستفید ہوا بقیۃ الفضلا خاتمۃ الادبا آقائی سید احمد ادیب پشاوری مدظلہ العالی ہیں۔ ان بزرگوار کی عادت تھی کہ گرمی کے موسم میں حسب عادت کسی ٹھنڈی جگہ پر امام زادہ صالح تجریش کے صحن میں تشریف فرما ہوے اور دو ایک گھنٹے اُسی جگہ ایک کونے میں نشست کرتے تھے۔ میں باوجودیکہ اُنکی تنک مزاجی سے ڈرتا تھا مگر حیلے بہانے ڈھونڈھ کر اُنکی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور ڈرتے ڈرتے کوئی سوال اُن سے ضرور پوچھتا جسکا جواب شافی وہ دیتے اور میں اُس کو فوراً اپنے دماغ کے خزانہ یا کسی نوٹ بک میں محفوظ کرلیتا۔ ان کا تبحر ادبیات فارسی و عربی میں اور ان کا عجیب و غریب حافظہ کہ ہزارہا اشعار علی الخصوص عربی اشعار ان کو ازبر تھے۔ فی الواقع آجکل کی اصطلاح میں محیر العقول تھا۔ مثلاً ہر وقت اور ہر مجلس میں جب کوئی شعر عربی پڑھا جاتا اور اہل مجلس کو پتہ نہ معلوم ہوتا کہ وہ شعر کس کا ہے یا کس زمانہ میں کہا گیا ہے تو وہ اُس کو سن کر تمام اشعار اُس قصیدہ کے جسکا وہ شعر ہوتا مع نام شاعر اور حالات شاعر اور سنہ شعر وغیرہ وغیرہ کے بے تامل نہایت تفصیل کے ساتھ بیان فرمادیتے۔ میں جب اُنکو دیکھتا تھا تو مجھ کو وہ حکایت یاد آجاتی جو عربی کی ادبی کتابوں میں حماد راویہ کے متعلق مشہور ہے کہ جس کو فقط شعرائے جاہلیت کے حروف تہجی کے اعتبار سے ہر ہر حرف کے سو سو بڑے بڑے قصیدے علاوہ مقطوعوں کے حفظ تھے اور شعرائے اسلام کا کلام مزید براں۔ چنانچہ خلیفہ ولید نے جب یہ حال سُنا تو اُسکو یقین نہ آیا اور اپنے ایک آدمی کو مقرر کیا کہ وہ جائے اور اُن کا امتحان لے۔ اُس نے دو ہزار نو سو قصیدے تفصیل مذکور سے اُن سے نقل کیے[1]۔ غرضکہ اُن کی قوت حافظہ، کثرت معلومات،

[1] دیکھو ابن خلکان حرف حاء ذکر حماد۔

حفظ اشعار و لغات اور نیز اُن کا فلسفیانہ مزاج، زہد و تقویٰ اور گوشہ نشینی اور اُنکے جمیع حالات اطوار کو دیکھ کر میں ہمیشہ اُنکا مقابلہ ابو العلاء معری سے کیا کرتا تھا اور اُس میں بھی یہ فرق تھا کہ ابو العلاء صرف ادبیات عربی میں نادرۂ دہر تھا اور یہ بزرگ دو زبانوں یعنی عربی و فارسی میں نابغۂ عصر۔ اُنکے اشعار کا دیوان اب سے دو تین سال قبل پیرس میں میں نے شاہزادہ نصرۃ الدولہ فیروز میرزا کے پاس دیکھا تھا - ہزار افسوس ہے کہ اب تک وہ چھپا نہیں ہے -

اُن بزرگوں میں کہ جنکا حق تربیت میرے اوپر ہے مرحوم شمس العلماء شیخ محمد مہدی[1] قزوینی عبدالرب آبادی ہیں - جو اپنے زمانہ کے مشہور ادیب اور میرے والد کے دوست اور "نامۂ دانشوران" کے چار مؤلفوں میں سے ایک تھے - والد کے انتقال کے بعد ان بزرگ نے ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا - اور والد کی تنخواہ میں سے ایک تھوڑا سا حصہ ہم لوگوں کے واسطے مقرر کرا دیا - جسکی مدد سے میری نیک ماں نے کہ اللہ اُن کی روح کو منور کرے ہم کو پالا اور پروان چڑھایا -

دوسرے وہ بزرگ کہ جنکے احسانات عظیم دربارۂ تعلیم و تربیت میری گردن پر ہیں مرحوم میرزا محمد حسین خان اصفہانی متخلص بہ فروغی ملقب بہ ذکاء الملک ہیں جو موجودہ ذکاء الملک آقائی میرزا محمد علی خاں مدظلہ العالی کے پدر بزرگوار تھے - تقریباً دس بارہ سال تک اپنے عہد شباب میں برابر اور اکثر ان بزرگوار کی صحبت میں جو اُس زمانہ کے شعرا و ادبا اور اہل ذوق کا مجمع تھی حاضر ہوتا اور اُن کی صحبت سے برابر مستفید ہوتا - یہ اُنھیں کی مشفقانہ توجہات اور پدرانہ تربیت کا نتیجہ ہے کہ میں نے کسب اخلاق حمیدہ کیا - اس دس بارہ سال کے عرصہ میں برابر اُنکے دونوں صاحبزادوں یعنی آقائی میرزا محمد علی خاں ذکاء الملک اور آقائی میرزا ابو الحسن خاں فروغی کے فیض صحبت سے بھی مستمراً فیضیاب ہوتا رہا - شروع میں میں موجودہ ذکاء الملک کی خدمت میں فرنچ پڑھتا تھا اور وہ مجھ سے درس عربی حاصل کرتے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں بوجہ موافقت مزاج و اخلاق و خیالات کے تعلیم و تعلم سے آگے بڑھ کے ایک مضبوط باطنی دوستی کا سلسلہ قائم ہو گیا جو آجکل کے ابنائے زمانہ کی دوستی کے موافق نہیں اور اس کا مدار حصول نفع اور دفع نقصان پر نہیں بلکہ اُس کی جڑ یگانگی مشرب اور اتحاد مذاق پر قائم و برقرار اور تدریجاً مضبوط ہوتی گئی اور میں امیدوار ہوں کہ یہ دوستی کہ جو اخوان الصفا کی دوستی سے کم نہیں ہے جب تک میری اور اُن کی حیات باقی ہے انشاءاللہ محکم و مضبوط رہیگی -

دوسرے اکابر علما میں سے کہ جو میرے ساتھ خاص لطف رکھتے تھے مرحوم شیخ فضل اللہ نوری

[1] جنگ عمومی کے زمانہ میں طہران میں وفات پائی - ٹھیک سنہ وفات اس وقت یاد نہیں ہے - صحیح ۱۳۲۵ھ میں طہران میں وفات پائی

تھے کہ جنھوں نے اپنے دو صاحبزادوں یعنے آقائی ضیاء الدین اور آقائی حاجی، میرزا ہادی کی نحوی تعلیم میرے متعلق کی تھی اور میں نے ان دونوں آقازادوں کو مسلسل دو تین سال تک پڑھایا اور اپنی ناقص معلومات کے مطابق اُن کو اُس فن سے آگاہ کرایا۔ جب میں پیرس میں پہلی مرتبہ مقیم تھا تو اُن مرحوم کے خط جو اُن کے خاص قلم کے تھے میرے پاس کبھی کبھی آتے رہتے تھے۔ جن کو ابتک بطور اُنکی یادگار کے میں نے رکھ چھوڑا ہے۔ انکے حرکات و اعمال کا بُرا نتیجہ کہ جو ان مرحوم کی آخری عمر میں اُن سے سرزد ہوے تھے جسکی وجہ سے اُنکی زندگی کا دفعتاً خاتمہ ہو گیا[1] اس سے اُن مرحوم کے مقامات علمیہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھوں نے اپنے اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں بھگتا۔ اصل واقعہ کا علم خدا کو ہے اور اب وہ پیوند خاک ہیں اور دنیا سے اُنکا کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ قدیم مقولہ ہے کہ "اُذکروا موتاکم بالخیر" (اپنے مرے ہوؤں کو نیکی سے یاد کرو) راقم الحروف کو اس مقام پر اُنکے ذکر سے اُنکے افعال کی مدح و قدح مراد نہیں۔ صرف یہ غرض ہے کہ اس جگہ اُنکی عنایتوں کا شکریہ اور قدیم حقوق محبت کا ذکر کیا جائے اور بس۔ زمانہ گزشتہ کے واقعات یاد کرکے بقول بیہقی کے میں نے قلم کو تھوڑا سا اُنکی ادہر دوڑا لایا۔

لندن کا سفر

شروع ۱۳۲۲ھ میں میرے بھائی میرزا احمد خاں نے جو بالفعل مفتش ادارۂ مالیات غیر مستقیم (Auditor of Indirect Revenues) ہیں اور جو اُسوقت لندن میں تھے چونکہ قدیم کتب کے ساتھ میرے شوق بلکہ میرے عشق سے واقف تھے، مجھکو لکھا کہ "نامناسب نہیں ہے کہ جب تک میں یہاں ہوں تم بھی لندن میں آجاؤ اور یہاں کے بڑے کتاب خانہ (British Museum) کی سیر کرو اُس کے بعد ہم دونوں مل کے وطن واپس چلیں گے" میں نے بھی اس مشہور مثل کے موافق کہ "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں" بلا تامل اس دور و دراز سفر کا ارادہ کرلیا۔ اور اپنی مادر شفقت سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو گیا کہ جو اُس وقت میرے پہونچانے کے واسطے دروازۂ قزوین کے باہر آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے کھڑی تھیں اور جس وقت ڈاک کی گاڑی چلنے لگی تو اُنھوں نے مجھ سے فرمایا کہ "بیٹا مجھکو یقین ہے اب میں تیرا چہرہ نہ دیکھ سکونگی"۔ الغرض پانچویں ربیع الثانی ۱۳۲۲ھ کو طہران سے رخصت ہو کر براہ روس و جرمنی و ہالینڈ (Holland) میں لندن پہونچا اور وہاں اُس کتاب خانۂ عظیم اور اُس کی عربی و فارسی نادر الوجود کتابوں کو دیکھ کر اُنکے مطالعہ کا اتنا شوق مجھ پر غالب ہوا کہ

---

[1] ۱۳ رجب ۱۳۲۷ھ کو طہران میں پھانسی پائی۔

بے اختیار اپنے خاندان اور وطن کو یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ بالکل بھول گیا مگر البتہ تھوڑے وقت کے واسطے (کہ یہ تھوڑا وقت بھی اب بیس سال سے گزر گیا ہے) اُن کا خیال میں نے اپنے دل سے نکال دیا۔

قیام لندن

قریب دو سال تک میں لندن میں رہا اور وہاں انگریز مستشرقین کی ایک جماعت سے ملاقات ہو گئی از انجملہ پروفیسر راؤان (A. A. Bevan) ہیں کہ جو ادبیاتِ عرب علی الخصوص جاہلین اور مخضرمین کے اشعار کے متخصص[۵۱] ہیں اور اس شعبہ میں کمتر کوئی شخص اُنکی قابلیت کا ہوگا۔ اپنے فن میں بہت بڑے متبحر اور اپنے کام میں انتہا درجہ دقت اور احتیاط سے کام لیتے ہیں جو بعض وقت وہم و وسواس کی حد تک پہونچ جاتی ہے چنانچہ نقائضِ جریر و فرزدق کو تین بڑی جلدوں میں بیس سال کی محنت میں ۱۹۰۵ء لغایت ۱۹۱۲ء میں بمقام لیڈن Holland طبع کرایا اور بے تکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی طباعت کو اتنی صحت و دقت کے ساتھ اس آخری صدی میں یورپ کا ایک بڑا ادبی شاہکار سمجھنا چاہیے۔

دوسرے مسٹر الیس (A. G. Ellis) ہیں جو برٹش میوزیم کے کتابدار سابق اور اوقافِ گیب (Gibb memorial) کے ایک ٹرسٹی ہیں۔ کتب قدیمہ کے پہچاننے اور کتب عربی و فارسی و ترکی کے نام اور انکے مصنفین کے حالات اور تعداد تصانیف کی واقفیت میں یدطولے رکھتے ہیں۔ انکی تیار کردہ "برٹش میوزیم" کی فہرست کتب مطبوعہ عربی کی دو بڑی جلدوں میں ایک نہایت بیش قیمت تالیف ہے۔

دوسرے اُسوقت علیہ[۵۲] مسٹر آمدروز (H. F. Amedroz) اوقاف گیب کے ایک رکن ہلال صابی کی "تاریخ الوزراء" اور ذیل تاریخ دمشق ابن القلانسی کی طباعت اُنکی یادگار ہیں۔

دوسرے مشہور مستشرق پروفیسر ادوارد براؤن (Edward G. Browne)[۵۳] کہ انکی شہرت میری ہر طرح کی وصف و تعریف سے مستغنی ہے یہ بھی اوقاف گیب کے ایک مشہور رکن اور انھیں کے توسط سے بعض کتابوں کی تصحیح و طبع کا کام امنائے مذکور کی طرف سے اس حقیر کو سپرد

---

[۵۱] متخصص کی جگہ بالعموم اُردو میں "ماہر خصوصی" کہتے ہیں۔ میں نے متخصص کو اس لیے بحیثیت اصطلاح رہنے دیا کہ اس میں ایک ہی لفظ ہے۔ مترجم

[۵۲] یہ لفظ اُس موقع پر استعمال کیا گیا ہے جہاں آجکل ہماری زبان میں "آنجہانی" بولتے ہیں۔ میں "اُسوقت علیہ" کو "آنجہانی" پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ آخر الذکر لفظ میں کوئی تاسف و ملال کا پہلو نہیں ہے۔ جو ہونا چاہیے۔ مترجم

[۵۳] ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔

ہوا تھا۔ (۲۰ رجمادی الآخر ۱۳۴۴ھ مطابق ۵ رجنوری ۱۹۲۶ء کیمبرج میں وفات پائی) ۱۳۲۴ھ کے شروع میں اوقاف گیب کے ٹرسٹیوں نے "تاریخ جہاں کشائے جوینی" کی تصحیح و طباعت مجھکو سپرد کرنا چاہی اور میں نے بھی باوجود اپنی بے بضاعتی اور عظیم الشان محنت و وقت کے اس کام کو متوکلاً علی اللہ قبول کرلیا اور اس مقصد کی انجام دہی کے واسطے ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۲۴ھ میں لندن سے پیرس کو روانہ ہوا کیونکہ وہاں متعدد نسخے اس کتاب کے موجود ہیں اور آخر ۱۳۳۲ھ تک پیرس ہی میں رہا۔

پیرس میں فرانساوی مستشرقین سے ملاقات

پیرس میں جن مستشرقین سے ملاقات ہوئی اور اُن سے میں نے استفادہ کیا حسب ذیل ہیں :-

(۱) مُسیو ہرتویک درنبورگ[۱] (Hartwig Derenbourg)

مشہور عربی داں اور طابع کتاب "سیبویہ" صاحب تالیفات مشہورہ۔ میں انکے لکچروں میں جو یمن کے قدیم خط حمیری (جسکو خط مسند بھی کہتے ہیں) اور اُسی خط کے قدیم کتبوں اور پتھروں کے متعلق عجائب خانہ لوور (Louvre) میں ہوتے تھے اکثر شریک ہوا ہوں اور غالباً وہ لکچر ہی لوور ہی میں ہوتے تھے۔

(۲) مُسیو باربیہ دو منار[۲] (Barbier de Meynard) جنھوں نے مسعودی کی "مروج الذہب" کا ترجمہ مع اصل نو جلدوں میں چھاپا ہے اور اسکے علاوہ اور بھی کتابیں طبع کرائی ہیں۔

(۳) مسیو میہ (A. Meillet) مشہور لغوی و نحوی۔ انھوں نے ہندوستان اور یورپ کی مختلف زبانوں کے صرف و نحو کا موازنہ کیا ہے۔ چند دن انکے لکچروں میں جو سا ربون (Sarbonne) میں ہوتے تھے حاضر ہوا ہوں۔

(۴) مسیو ہوارت[۳] (Clement Huart) جنھوں نے عربی و فارسی و ترکی کی کئی تصانیف کا ترجمہ یا تصحیح کی مگر کسی خاص فن میں متخصص نہیں ہیں۔

پیرس ہی کے قیام میں آقائی میرزا علی اکبر خاں دہخدا سے شرف ملازمت حاصل ہوا۔

---

[۱] ۱۹۰۸ء میں پیرس میں وفات پائی۔

[۲] ۱۹۰۹ء میں پیرس میں وفات پائی۔

[۳] دسمبر ۱۹۲۶ء میں پیرس وفات پائی

یہ ایک مشہور عالم و مصنف شروع استبداد صغیر[۱] میں ایک جماعت اہل ایران کے ساتھ اپنا وطنِ مالوف چھوڑ کر پیرس آ گئے تھے۔ انکی خدمت میں میں اکثر حاضر ہوتا اور انکی صحبت سے بیحد محظوظ ہوتا۔ سچ پوچھیے تو جو لطف میں نے اپنی عمر میں اس دنیا میں اٹھایا وہ وہی زمانہ تھا اور میں آرزو کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ مرنے سے پہلے یہ سعادت پھر نصیب ہو۔

انکے علاوہ جناب آقائی حاجی سید نصر اللہ اخوی دامت برکاتہ' سے جو زمانہ موجودہ کے مشہور عالموں، شاعروں، اور ادیبوں سے ہیں مجھکو غائبانہ ملاقات نصیب ہوئی یعنی جس زمانہ میں میں "مرزبان نامہ" کی تصحیح و طباعت میں مشغول تھا ان بزرگ نے کمال اطمینان و فیاضی کے ساتھ کہ جو صرف انھیں سے متوقع ہو سکتی تھی اپنا صحیح کیا ہوا نسخہ اصل کتاب کا بغیر کسی سابقہ ملاقات اور اعتماد کے مجھکو عنایت کیا اور اسی وقت سے اب تک سلسلۂ خط و کتابت اُن بزرگ کے ساتھ جاری ہے جو میری سرفرازی کا باعث ہے۔

آخر ۱۳۳۲ھ میں جب جنگ عمومی چھڑ گئی اور دنیا کے تمام کاروبار معطل ہو گئے (وجہ یہاں لکھنا بے موقع ہے) جس کی وجہ سے میرا خاص کام پیرس میں رہ کر انجام پانا ناممکن ہو گیا تو آقائی حسین قلی خاں نواب نے جو میرے قدیم عنایت فرما اور اُس وقت پیرس میں تھے اور اتفاق سے برلن کی سفارت پر مقرر ہو کر جانے والے تھے مجھ سے فرمایا کہ اب تم پیرس میں رہ کر کیا کرو گے آؤ ہمارے ساتھ برلن چلو اور دو تین مہینے وہاں رہو۔ وہاں کی بھی سیر کرنا اور دو تین مہینے کے بعد جب جنگ ختم ہو جائے گی اور کاروبار اپنی اصلی حالت پر آ جائے گا پیرس پھر واپس آنا۔

اس تجویز کو کمال شوق سے قبول کر کے ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۴ء پیرس سے روانہ ہوا اور سوئیس (Switzerland) کی راہ سے انھیں کی ہمراہی میں چار دن کے بعد برلن پہونچا۔ راستہ میں باوجود سخت دقتوں کے جو جنگ کی وجہ سے تمام مسافروں کو سفر میں ہوتی تھیں خاص کر جب سفر ایک محارب ملک سے دوسرے میں ہوتا۔ مگر چونکہ میں ایک وزیر مختار کی ہمراہی میں اور گویا انھیں کے اسٹاف میں تھا الحمد للہ کہ ان دقتوں اور تکالیف کا سامنا ہم لوگوں کو نہیں ہوا البتہ ہمارے داخلۂ برلن کے تھوڑے ہی دنوں بعد تمام آمد و رفت لوگوں کی جرمنی سے قطعاً بند ہو گئی اور دو تین مہینے دو تین سال ہو گئے اور پھر بھی جنگ کا خاتمہ

---

[۱] "استبداد صغیر" سے غالباً وہ زمانہ مراد ہے جو مظفر الدین شاہ کے آخر عہد میں آزادی پسندوں کے ساتھ سخت جبر و ظلم کا تھا بمقابلہ "استبداد کبیر" کے کہ جو محمد علی شاہ کے زمانہ میں ہوا۔ (مترجم)

نظر نہیں آتا تھا۔ الغرض ساڑھے چار برس یعنی اختتام جنگ تک میں برلن ہی میں رہا اور جو صدمے اور مصیبتیں کہ اس مدت میں "قحط عام" سے تمام اہل ملک نے اُٹھائیں اُن کا ذکر اس مختصر مقالہ میں قطعاً محال ہے۔ اُسکے لیے ایک کتاب "روضۃ الصفا" کے حجم کے برابر چاہیے اور میں اس کام کو اُن لوگوں کے حوالے کرتا ہوں جو آیندہ جنگ عظیم کی تاریخ لکھیں۔

قحط عام کا لفظ جو میں نے اوپر کے فقرے میں استعمال کیا اُس سے میرا مطلب یہ ہے کہ قحط میں معمولاً تنگی رزق صرف دو ایک چیزوں کی ہو سکتی ہے مثلاً روٹی یا گوشت یا اسکے سوا کوئی چیز۔ مگر اس جنگ عظیم کے اثنا میں چونکہ جرمنی کا محاصرہ بری و بحری دول متفقہ نے پوری طرح کر رکھا تھا اس طرح کہ جنگی جہازوں اور پندرہ ملین فوج کے ذریعہ سے گویا اُس کے گرداگرد ایک لوہے کی دیوار قائم کردی گئی تھی کہ جس کا توڑنا یا پھاندنا غیر ممکن تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام چیزیں مطلقاً اور کُلی طور پر روٹی، آٹے، گوشت وغیرہ کی قسم سے یہاں تک کہ آلو، چاول، تمام اقسام غلہ، دودھ، پنیر، روغن اور تمام چیزیں کہ جو ان سے بنتی ہیں اور قند و شکر، مربّے، شہد، صابن، جوتے، ٹوپے، کمبل، اونی کپڑے، تمام ماکولات اور کُل استعمال و ضرورت کی چیزیں بالکل نایاب اور عنقا ہو گئی تھیں وجہ یہ تھی کہ ضروری اشیاء کو سلطنت نے اپنے تصرف میں لیلیا تھا اور ملک کے رہنے والوں پر فی کس ایک معیّن حصہ اور ایک معیّن مدت کے واسطے تقسیم کیا جاتا تھا۔ مگر اُسکی مقدار سُنیے! مثلاً ہفتہ بھر کے لیے فی کس ۲۶ سیر[۱] روٹی - ۳ سیر گوشت - ۵ مثقال یعنی ۲۵ گرام روغن اور مہینہ بھر کے واسطے ½ ۴ سیر شکر، ایک انڈا اور تمام اشیا اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔ اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ ہم ایرانی نسبت اہل ملک کے بہت خوش نصیب تھے اس واسطے کہ آقائی تقی زادہ کی کوشش بلیغ سے چونکہ ہم لوگ جنگ سے بے طرف (نیوٹرل) اور دولت جرمنی کے مہمان تھے ہم کو فی کس اشیاے مذکورہ کا دونا حصہ دیا جاتا تھا۔ یعنی ہفتہ میں بجاے ۵ مثقال روغن کے ۱۰ مثقال اور بجاے مہینہ میں ایک انڈے کے دو انڈے بلاکسر مرحمت ہوتے تھے۔

مختصر یہ کہ اس چار پانچ سال کی مدت اپنے قدیم دوست اور عنایت فرما محترم آقائی سید حسن تقی زادہ کی مصاحبت میں بسر ہوئی اور اُن فاضل علامہ کی علمی و ادبی صحبتوں سے میں برابر مستفید ہوتا رہا۔ ان بزرگوار نے اُس زمانہ میں سلطنت جرمنی کی اعانت سے ایک انجمن موسوم بہ "کمیتہ ایرانی"

---

[۱] سیر سے ایرانی سیر مراد ہے جو تقریباً ڈیڑھ چھٹانک کا ہوتا ہے - ۲۶ سیر تقریباً ½ ۲ سیر ہندوستانی کے برابر ہوے - دوسرے اوزان بھی اسی پر قیاس کرلینا چاہئیں - (مترجم)

(Iranian Committee) قائم کی تھی جس میں تمام معزز اہل ایران جو اس اثناء میں بسبب راہ آمد و رفت بند ہو جانے اور روابط اتحاد و دوستی منقطع ہو جانے کے مثل بیچارے مسافروں کے ادھر اُدھر سرگرداں تھے - ہر چند کہ وہ اپنے وطن میں خوش حال اور متمول تھے - آقائی تقی زادہ نے اس کمیٹی کے ذریعہ سے ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا تھا جس کی وجہ سے ایک جماعت کثیر ہمارے ہموطنوں کی اس عالمگیر طوفان کے صدموں سے بے خطر اور اُس گرم ہوا کے تیز جھونکوں سے کہ جو خشک و تر ہر چیز کو جلائے ڈالتی تھی ہماری جانیں محفوظ رہیں -

بلکہ سچ پوچھیے تو اس چار پانچ سال کے عرصہ میں فضلائے ایران کی ایک منتخب اور عمدہ جماعت برلن میں قائم ہو گئی تھی اور مختلف اشخاص جو ایسے مشاغل و کاروبار کے ذریعے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے - آقائی تقی زادہ کی کوششوں سے ایک نقطہ پر جمع ہو گئے تھے اور جس طرح بھیڑیوں کا گلّہ طوفان کے وقت سر جوڑ کے اکھٹا جمع ہو جاتا ہے اُسی طرح ہم مصیبت زدہ بھی کمال اتحاد کے ساتھ بسر کرتے تھے اور ملین انسانوں کی قربانی جو ہمارے چاروں طرف مختلف میدان جنگ میں ہو رہی تھی - ہم کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی سینما میں چند متحرک صورتیں دیکھ رہے ہیں یا کبھی زخمی ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے سپاہیوں کا منظر کسی راستہ گلی میں ہمارے پیش نظر ہو جاتا - یا بڈھوں اور عورتوں کی لمبی لمبی قطاریں نانبائی و قصاب و بقال کی دوکانوں کے سامنے جبکہ برف پڑتی ہوتی یا مینہ برستا ہوتا اور یہ بیچارے چھلکے اپنے مقررہ حصوں کے انتظار میں کھڑے ہوتے - بس اس کے علاوہ جنگ کے خارجی آثار ہمارے دیکھنے میں نہیں آتے تھے اور نہایت آرام و اطمینان ظاہری کے ساتھ ہمارا یہ زمانہ گزرتا تھا - (باقی)

انسان

(جناب میاں عبدالعزیز صاحب فطرت)

دستِ قدرت کی گو ہے صنعت انسان
بزم فطرت کی بھی ہے زینت انساں
سب کچھ ہے مگر ہے ایک مشتِ گِل بھی
بھولے نہ کبھی بھی یہ حقیقت انساں

بدنام ترک کس طرح واپس آیا

(جناب مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب مترجم اخبار الاندلس)

"بدنام ترک" کی یہ دوسری قسط حاضر ہے اور امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ بزرگ محترم مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ اس پیرانہ سالی کے باوجود ترکوں کے متعلق بہترین کتاب کے نہایت پرمعلومات اور منصفانہ مضامین کا ترجمہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائی اور الناظر کو اس بات کی عزت حاصل ہوئی کہ یہ قیمتی تحریر شایع کرکے اُردو داں طبقے کے روبرو پیش کرے۔

ترک اور ترکوں کے متعلق اُردو میں بہت سا سالہ موجود ہے اور محاربۂ عظیم کے سلسلے میں بھی بہت سی کتابیں، رسائل اور مضامین نکل چکے ہیں مگر یہ مضامین نہایت قیمتی ہیں اس لیے کہ ایک ایسے غیر مذہب اور غیر ملک کے منصف مزاج اہل قلم کے لکھے ہوے ہیں جسکے معلومات کا ذخیرہ بہت وسیع ہے۔

ہماری دلی تمنا ہے کہ مولوی صاحب ممدوح اس کتاب کے بقیہ ابواب کا بھی ترجمہ کرڈالیں اور اس کا انتظار نہ فرمائیں کہ دوسرا کوئی اہل قلم اس زحمت کو برداشت کرے۔ اہل قلم کی ملک میں کمی نہیں مگر خاص خاص لوگوں کے سوا عام طور پر ترجمہ کرنے میں لوگ بہت بیباک ہیں اور مالی منفعت کی دھن میں مصنفین کی محنت وجاں فشانی کی پروا نہیں کرتے اور اس بے احتیاطی سے ترجمہ کرتے ہیں کہ اصل کتاب کے مطالب اور مصنف کے منشا سے بہت دُور جا پڑتے ہیں۔

ایڈیٹر

جب وقت، ہیے کے ورقے کھولے گا، تو معلوم ہوگا کہ مُدانیا کے التوا جنگ کے وقت سے لوزان کے معاہدے پر دستخط ہونے کے وقت تک، جو پانچ برس گزرے ہیں، اس تھوڑے سے زمانے میں اتحادیوں کی جو پالیسی ترکوں کے متعلق رہی ہے وہ نہایت ناقابل معافی تھی اور تنگ نظری پر مبنی تھی؛ اور جو کارروائیاں اس عرصے میں ہوئی ہیں وہ ناقابل فہم تھیں۔ دنیا کی بڑی بڑی اقوام اس قسم کے جرائم کی شاید اتنی مجرم کبھی نہ ہوئی ہوں گی، جیسی کہ اُس وقت۔ جب اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ترکوں نے یکایک اپنی لڑائی کو ختم کیا ہے؛ تو باسفورس کے کناروں پر ٹوٹے پھوٹے، خراب خستہ، کیڑوں کے کھائے ہوے عثمانی ترکوں کے جہازوں کے ڈھیر ہی نظر آتے تھے۔ شکست خوردہ،

پریشان، اپنی حفاظت کے ناقابل، مردہ دل، ٹرکی کا ملک پوری طرح اتحادیوں کے رحم پر تھا۔ ترک جنگ سے تھکے ہوے تھے، اور وہ اپنے پرانے رہنماؤں سے بیزار تھے، کیوں کہ اُنھوں نے قوم بھر کو آفت و مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ تمام ملک بس ایک لفظ "قسمت" کہکر صبر کر بیٹھنے والا ہی، اور اُن کی تقدیر کی لکھی جو تدبیر و ترکیب، خواہ وہ تقسیم ملک کی ہو یا کسی کے پناہ میں آجانے کی، اتحادی اُن کو بتلادیں گے اُس پر وہ قناعت کر لیں گے۔ اگر صلح کی کوئی فوری کارروائی انصاف سے اور واجبی طور پر کی جاتی تو وہیں کا وہیں فیصلہ ہو جاتا، لیکن خود مطلبی، ایک دوسرے کی نا اعتباری اور جلاپے، خفیہ سیاسی ریشہ دوانی، شہنشاہی طمع و آز و بلند نظری، نا انصافی، نفرت اور لالچ نے طول دیا اور فیصلہ نہ ہونے دیا۔ اس میں لازماً دیر لگی اور اس دیر نے ترکوں کو کچھ سانس لینے کی مہلت دی، جس کی اُنھیں سخت ضرورت تھی۔ اُنھیں اتنا موقعہ ملا کہ اُنھوں نے آنکھیں کھول کر یہ دیکھ لیا کہ اُن کے لیے کیا کیا تیار رکھا ہی۔ اس مہلت نے اُنھیں اس قابل بنا دیا کہ اُنھوں نے بالکل نئے اور مضبوط مسالے سے ایسا جہاز بنا لیا جس پر وہ طوفان خیز سمندر میں سفر کر کے پار اُتر جاویں۔ چنانچہ جب جولائی ۱۹۲۳ء میں لوزان کے معاہدے پر دستخط ہوے ہیں تو تمام مشرق قریبہ اتحادیوں کی سیاسی تدابیر، اتحادیوں کی بلند نظری اور اتحادیوں کی عزت و آبرو کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے چھپا ہوا نظر آتا تھا۔ قسمتوں کے پلٹے کھانے کی ایسی مثالیں تاریخوں میں بہت ہی کم نظر آویں گی!

جن وجوہ سے کہ ترکوں کو آخرکار اتنی کامیابی نصیب ہوئی، اُن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہی کہ ان پانچ سالوں کے واقعات و حالات مختصر طور پر بیان کر دیے جاویں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اگر تمام نشانات و قیاسات نہ مٹ جاتے تو یہ اندازہ تھا کہ اس زمانے سے ایشیائی تاریخ اور مشرق اور مغرب کے دور کا ایک نیا باب شروع ہونے والا ہی۔

جس باہمی نا اعتباری اور رشک و حسد نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ اتحادیوں کے اتحاد کو توڑ پھوڑ ڈالا، اُس نے صلح کے فیصلے میں اتنی دیر لگادی کہ ترکوں کو ایک موقعہ مل گیا، جس کو اُنھوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ ضایع نہیں ہونے دیا۔ اس کی وجہ میری رائے میں وہ خفیہ من سمجھوتا تھا جو سائکس اور پیکاٹ کے درمیان میں ہوا۔ جنگ عظیم کی خفیہ سیاسی ریشہ دوانیوں کی تاریخ میں میرے جیسے آدمی کے خیال کے موافق، کوئی ایسا واقعہ نہ ملے گا جیسا کہ ان دو آدمیوں [illegible] خفیہ [illegible] کا واقعہ۔ ان دو آدمیوں میں سے ایک سر مارک سائکس ایک انگریز

سیاح اور مستشرق تھا اور دوسرا جارج پکاٹ، جو کسی زمانے میں دمشق میں فرانس کا کانسل رہا تھا۔ یہ دونوں ماہ مے ۱۹۱۶ء میں کہ ابھی جنگ عظیم کے ختم ہونے میں دو سال باقی تھے، ایک جگہ مل کر بیٹھے اور انھوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ تمام مغربی ایشیا کے حصے بخرے کر کے اپنے اپنے ملکوں کو بخش دیے۔ اس عطا پاشی کے وقت نہ انھوں نے اتحادیوں سے رای لی، نہ منقسمہ ملک کے باشندوں کے حقوق کا خیال کیا، نہ اُن کی خواہش معلوم کی۔ لطف یہ ہو کہ چند روز بعد اس ضرر رساں معاہدے کو برطانیہ عظمیٰ اور فرانس کی حکومتوں نے شرف قبولیت بخش دیا۔ اس معاہدے کے ذریعے سے ملین انسانوں کی قسمت کا اس بے دردی سے فیصلہ کر دیا گیا کہ گویا وہ بنی نوع انسان نہ تھے بلکہ کوئی بے روح جانور تھے۔

سائکس۔ پکاٹ کا معاہدہ مختصر طور پر یہ تھا کہ فرانس کے حلقۂ اثر میں شام، سلیشیا اور جنوبی آرمینیہ رہے؛ دمشق، حلب، عرفہ[له]، دیرالزور اور موصل فرانس کی "حکومت حکم برداری" میں دیدیے جاویں۔ فلسطین ایک بین الاقوامی ریاست بنادی جاوے۔ عراق عرب، اس شرط کے ساتھ کہ اس کو بندر حیفہ کی راہ سے بحر روم کا راستہ دیا جاوے، برطانیہ کے حلقۂ اثر میں رہے اور اس میں تمام ملک عرب شامل ہو۔ مگر ۱۹۱۸ء میں لائڈ جارج نے کلیمنشو کو اس پر آمادہ کر لیا کہ موصل برطانیہ کو دے دیا جاوے اور اس کے معاوضے میں لائڈ جارج مدد کرے گا کہ فرانس کے حقوق شام پر قائم ہو جاویں۔ لیکن جب وریل کی کانفرنس ہوئی تو اس عہدنامے کے متعلق کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ برطانیہ نے اس پر زور دیا کہ اس کو موصل بلا کسی شرط کے دیا گیا ہے؛ دوسری طرف فرانس نے یہ ضد کی کہ موصل صرف اس شرط اور سمجھوتے پر برطانیہ کو ملا ہے کہ فرانس کو وہاں کے تیل کا ایک حصہ دیا جاوے گا۔ یوں اتحادیوں کے ان دونوں فریقہای اعظم میں کٹا چھنی شروع ہو گئی۔

اب اس بات کو بھی سمجھ رکھنا چاہیے کہ مشرق قریبہ کے معاملے میں برطانیہ عظمیٰ اور فرانس کی پالیسیاں ایک دوسرے کے بالکل خلاف ہیں اور ہمیشہ سے خلاف رہتی آئی ہیں۔ مشرق قریبہ میں فرانس کے جو ارادے ہیں، اُن کو برطانیہ نے کبھی دوستانہ، بلکہ بے غرضانہ نگاہ سے بھی نہیں دیکھا۔ اسی طرح برطانیہ کا جو اثر و رعب اس علاقے میں برابر بڑھتا جاتا ہو اُس کو فرانس ہمیشہ مشکوک نگاہوں ہی سے دیکھتا رہا ہو:

له مقامات کے جو نام اس تمام مضمون میں آئے ہیں اُن کی صحت کی ذمہ داری راقم آثم اپنے ذمے نہیں لیتا۔

جس دن سے کہ برطانیہ نے ترکوں کے خلاف مہم شروع کی ہے، انگریز اگرچہ بظاہر اس پالیسی پر چل رہے ہیں کہ تمام رعایا کا لحاظ و خیال رکھا جاوے گا، مگر فی الحقیقت وہ پالیسی "شاہنشاہانہ" تھی۔ یہ اصطلاح یقیناً اس کو چاہتی ہے کہ تمام عربی ایشیا پر حقیقی طور سے قبضہ کر لیا جاوے اور اس ذریعے سے ہندوستان اور افریقہ کو ایک دوسرے سے ملا دیا جاوے۔ برطانیہ کے سیاسی مدبرین اتنے تو ضرور ہوشیار تھے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ دنیا اُن کے عراق عرب پر قبضہ کر لینے کو گوارا کر جاوے گی، (اگرچہ یہ علاقہ اتنا دُور اُفتادہ ہے کہ نہ اُس کی کوئی پروا کرتا ہے، نہ کسی کو اس کی خبر ہے) مگر دنیا کا ہر شخص یقیناً خاص ٹرکی کے کسی حصے پر برطانیہ کے قبضے کو ناپسندیدگی اور شک کی نگاہ سے دیکھے گا۔ اُنھوں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اگر برطانیہ اُن وعدوں سے روگرداں ہو جاوے جو اُس نے اپنی رعایا، ہندوستانی مسلمانوں سے کیے ہیں کہ ترکوں کا کوئی علاقہ اپنی سلطنت کے ساتھ ضم نہ کرے گا، تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اُن کو بغاوت پر خود ہی آمادہ کر دیا؛ اور اس صورت میں بغاوت ہو جانے کا امکان کچھ بعید بھی نہ تھا۔

لیکن انگلستان یورپ میں رائے عامہ کو نہیں ٹھکرا سکتا تھا، نہ اپنی مسلمان رعایا کو، ٹرکی کے علاقے اپنے ساتھ ضم کر کے اپنا مخالف بنا سکتا تھا، نہ وہ اپنے پہلو میں ایسی ٹرکی کو پال سکتا تھا، جو اُس سے ایک تو ناراض تھی، اور دوسرے ممکن تھا کہ چند روز کے بعد اتنی قوی ہو جاتی کہ مغربی ایشیا میں جو انگلستان کے اغراض و مقاصد تھے اُن کو نقصان پہنچانے کی دھمکی دے سکتی۔ برطانیہ کو کوئی ایسی ترکیب ایجاد کرنی پڑی کہ جس کے ذریعے سے وہ بالواسطہ ٹرکی کو ہمیشہ کے لیے کمزور کر دے۔ اس معمے کو اس نے یوں واقعی یا خیالی طور پر حل کیا کہ یونانیوں کو اپنے ملک کی حدود بڑھانے کی جو خواہشیں ہیں اُن کی اور تشویق کی جاوے اور اُن کی اس جوع الارض کا شکار ٹرکی کو بنایا جاوے۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ یونان کو مدد پہنچانے کے بدلے میں وہ لیوانٹ میں ہمارا دیا ہی غلام بن جاوے گا، جیسا کہ فرانس مشرقی یورپ میں یہ امید کر رہا تھا کہ پولینڈ میں (یونانیوں کا سا) کھیل کھیلے گا۔ صاف الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ یونان کو انگلستان اپنا ایسا دستپناہ بنانا چاہتا تھا کہ اُس سے پکڑ کر آگ پر سے اپنی ہانڈی اُتارا کرے۔ اس لیے لائڈ جارج کی گورنمنٹ نے شروع ہی سے تھریس اور اناطولیہ پر یونان کے دعوے کی حمایت کی؛ بالکل اُسی طرح جیسے اُس نے حجاز کے بادشاہ (شریف) حسین کے دعوے کی سرزمین عرب کے لیے کی تھی۔ اس گورنمنٹ نے یہ حساب لگا لیا کہ اگر اور جب تک یہ حکومتیں برطانیہ کی مُٹھی میں رہیں اُس وقت تک اُس کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ اُن علاقوں پر کس کا پرچم لہرا رہا ہے۔

مقصود اصلی تو یہی تھا کہ یہ علاقے برطانیہ کی مٹھی میں رہیں۔ انگلستان نے کبھی اس کی پروانہیں کی کہ برائے نام حکومت کس کی ہو، بہ شرطے کہ اصل دھن دولت اُسی کو ملتا رہے۔

قسطنطنیہ کے متعلق برطانیہ کے جو ارادے تھے اُن کا اہم اندازہ وقیاس ہی لگا سکتے ہیں، مگر بہرحال یہ یقین کرلینے کے پورے دلائل موجود ہیں کہ باوجود ہرطرح کے انکاروں کے برطانیہ عظمیٰ کا یہ ارادہ تھا کہ درہ دانیال کو اپنا ویسا ہی مضبوط قلعہ بنالے جیسا کہ جبل طارق اور سوئز میں بنائے ہوئے ہو اور اس ذریعہ سے بحر روم، ہر ضرورت کے لحاظ سے، برطانیہ کی گویا ایک جھیل بن جاوے۔ یہ امر کہ، یہی مقصود اصلی تھا، مشکوک ہو۔ لیکن فرانس اور اٹلی کو اس کا یقین کامل تھا کہ انگلستان کے یہی ارادے تھے۔ اُن کے شکوک میں اس وجہ سے اور بھی کمی نہیں آئی کہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا آہستہ آہستہ یہ بات معلوم ہوتی جاتی تھی کہ اس پالیسی سے برطانیہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ بحر روم میں فرانس اور اٹلی کی بحری طاقت کے مقابلے میں ایک غلاموں کی سی یونانی حکومت آہستہ آہستہ کھڑی ہو جاوے۔

مشرق قریبہ کے مسئلے پر جس وقت ایک شور وشغب برپا تھا تو امریکہ میں بار بار یہ پوچھا جاتا تھا کہ: "فرانس اور اٹلی وہ پالیسی کیوں اختیار کیے ہوئے ہیں جس پر وہ اس وقت لیوانٹ میں عمل کر رہے ہیں؟ عیسائی اقوام اپنے حلیف انگلستان کے خلاف ترکوں کی کیوں حمایت کر رہی ہیں؟" اس سوال کا جواب اتنا صاف وصریح ہو کہ اسی پر تعجب ہوتا ہو کہ یہ سوال کیا ہی کیوں گیا! ٹرکی کے متعلق جو فرانس کی پالیسی تھی وہ اس امر پر موقوف تھی کہ فرانس کو نقصان پہنچا کر انگلستان لیوانٹ میں نفع اُٹھا رہا تھا۔ ٹرکی کے متعلق اٹلی کی پالیسی کی اصلیت یہ تھی کہ انگلستان کا حلیف یونان، اٹلی کو نقصان پہنچا کر لیوانٹ سے فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ اگرچہ اٹلی بحر روم کی بڑی طاقت ہو اور جنگ عظیم میں اُس نے نقصان بھی بہت اُٹھایا تھا مگر ٹرکی کی لُوٹ سے اسے جو کچھ ملا وہ صرف یہ تھا کہ ایشیائے کوچک کے جنوبی کنارے پر اُس کے زیر اثر ایک علاقہ تسلیم کر لیا گیا۔ دوسری طرف یونان تھا۔ شروع زمانۂ جنگ میں اُس کا رویّہ قریبًا فریب کارانہ رہا تھا اور جب وہ لڑائی میں شامل ہو چکا تو اس کو نقصانات بھی برائے نام ہی پہنچا تھا، مگر جب وہ لڑائی میں سے نکلا ہو، تو، خواہ کاغذوں ہی پر سہی، اُس کو اٹلی کے مقابلے میں المضاعف حصہ ملا۔ رہ گیا فرانس، اُس کو "مرد بیمار" کے ترکے میں سے صرف شام اور سلیشیا پر قناعت کرنا پڑی۔ دوسری جانب برطانیہ عظمیٰ نے خاموشی کے ساتھ فلسطین، عراق عرب اور عرب کو ہضم کر لیا۔ اُس کو وہ علاقہ ملا جس کو مسٹر ونسٹن چرچل نے "نئی وسطی مشرقی سلطنت" سے موسوم کیا تھا۔ ایک اور مصنف کہتا ہو کہ: "اُس

(برطانیہ) نے مغربی ایشیا کے ساتھ وہ تمام علاقہ لیا جو قاہرہ اور کلکتے کے درمیان اور خلیج فارس اور بحیرۂ خزر کے درمیان واقع ہے؛ اور اُن کے علاوہ اُس نے قسطنطنیہ پر قبضہ جما لیا۔" یونان کو اپنا غلام بنا کر برطانیہ کا اگرچہ پرچم نہیں، تو اُس کا اثر اُس وسیع علاقے تک پہنچ گیا جو جبال بلقان سے آبنائے ملاکا کے درمیان اور بحر خزر اور راس امید تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ جب فرانس اور اٹلی نے غور کیا تو یہ دیکھا کہ اُن کے فوائد انگریزی۔ یونانی حلیفوں کی وجہ سے معرض خطر میں ہیں؛ بالآخر اُنھوں نے سخت گھبراہٹ کے عالم میں ہر سہ طاقتوں کے عہدنامے کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ترکی قوم پرست فریق سے علیحدہ عہدنامہ کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس سلیشیا سے اور اٹلی اڈالیہ (عدلیہ؟) سے ہٹ آوے اور ترکوں کی کثیر التعداد فوج کو یونان کے خلاف اناطولیہ میں اور برطانیہ کے خلاف دردانیال میں کام کرنے کے لیے اکیلا چھوڑ آوے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس اور اٹلی نے ترکوں کو سامان حرب وضرب دیا۔ ان دونوں کا فائدہ اسی میں تھا کہ بحر روم کے مشرقی ساحل پر قوی اور دوست ٹرکی رہے، مگر برطانیہ عظمیٰ کا دست پروردہ یونان نہ رہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کا نام ہے "شہنشاہیت کی رقابت!"

مُدانیا کا التوائے جنگ کا معاہدہ، جس پر ۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کی آدھی رات کو دستخط ہوئے ٹرکی کی شرکت جنگ عظیم کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اس عہدنامے کی شرائط کے موافق اتحادیوں نے فی الفور قسطنطنیہ اور دردانیال پر قبضہ کر لیا اور اناطولیہ میں جو ترکی فوجیں تھیں اُن سے ہتھیار رکھوا لینے اور اُن کو موقوف کرنے کی کارروائی شروع کر دی۔ اگرچہ صلح کرانے والوں نے ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں پیرس میں جمع ہو کر ترکوں کے مسئلے پر بحث وتمحیص کی تھی، مگر صلح نامے کے مسودے کو تیار کرنے کے سوال پر فروری آئندہ تک سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ اس دیر کی وجہ کچھ تو یہ اُمید تھی کہ امریکہ صلح کی ایک فریق بنے گا، اور کچھ یہ کہ خود اتحادیوں کے آپس میں اس مسئلہ پر اتفاق نہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے غیر ترکی حصص کی "حکم برداری" کس کو ملے۔

پریزیڈنٹ ولسن کی صلح کی قرارداد چودہ قراردادوں سے بارھویں قرارداد یہ تھی کہ ان غیر ترکی علاقوں کو "بغیر کسی قسم کی دست اندازی کے یہ موقعہ دیا جاوے گا کہ وہ اپنی خودمختاری کی نشو ونما کریں گے"۔ معاہدہ ورسیل کی بائیسویں دفعہ کا یہ مطلب تھا کہ اُن میں سے کم از کم چند کو، جس کسی کی حکم برداری اُنھیں منظور ہو اُسی کے تحت میں، بہ حیثیت آزاد اقوام کے تسلیم کر لیا جاوے گا۔ ان حکم برداریوں کے بڑے دعوے دار دو تھے: ایک برطانیہ عظمیٰ اور دوسرے

فرانس۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس وقت سے تین برس پیشتر ان میں خفیہ من سمجھوتا (سائکس اور پکاٹ کا معاہدہ) ہو چکا تھا کہ مغربی ایشیا کے کون کون سے حصص آیندہ کہاں کہاں اور کس کس کے زیر اثر رہیں گے۔

فوائد و مقاصد کا سب سے بڑا تصادم فرانس اور حجاز کے درمیان شام کے عربی اضلاع کے متعلق تھا۔ اس کے متعلق میں اگلے باب میں تفصیل بیان کروں گا۔ سردست یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ حجاز "برطانیہ کی ایک نئی پیداوار" تھا، اور اس کا بادشاہ (شریف) حسین برطانیہ ہی کا دست پروردہ تھا۔ اب یہ امکانات پیدا کیے گئے کہ فرانس، اٹلی اور یونان کے دعاوی کی اشک شوئی کردی جاوے اور ان کو ایشیاء کوچک میں علاقے دے دیے جاویں؛ حال آں کہ پریزیڈینٹ ولسن کا حتمی وعدہ یہ تھا کہ ٹرکی کے رہنے والوں کا اتحاد ملحوظ رکھا جاوے گا اور قسطنطنیہ کا تصفیہ (آیندہ) کیا جاوے گا۔ اس اشکال کا ماہ فروری سنہ ۱۹۲۰ء میں لنڈن کانفرنس میں یوں دفعیہ کیا گیا کہ یہ اعلان کر دیا گیا کہ قسطنطنیہ ترکوں کا دار السلطنت رہے گا؛ مگر اس کے ساتھ ہی ترکوں کو مطلع کر دیا گیا کہ یہ رعایت ان کی آیندہ "نیک چلنی" پر مشروط ہے۔ دو ہی ہفتوں کے بعد سین ریمو کی کانفرنس نے برطانیہ کو عراق عرب اور فلسطین کی حکم برداری دے دی اور فرانس کو شام اور سلیشیا کی۔ لیگ آف نیشن اور امریکہ کی سینیٹ نے آرمینیہ کو کسی کی بھی حکم برداری میں دینے سے انکار کر دیا۔ آخر ۱۱ مے کو عہد نامے کا مسودہ سیورے میں ترکوں کے سفیروں کے حوالے کر دیا گیا اور انھوں نے ۱۰ اگست سنہ ۱۹۲۰ء کو اس پر دستخط کر دیے۔

آیندہ جو واقعات پیش آوے ان کی روشنی میں اس دستاویز پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس معاہدے کی شرائط کے موافق دردانیال، مارمورا اور باسفورس کے ساحلی علاقے، بعض خاص ضرورتوں کے لیے، ایک کمیشن کی تحت میں دے دیے گئے تھے، جو مختلف سلطنتوں کے نمایندوں سے بننے والی تھی۔ قسطنطنیہ کا شہر سلطان کے پاس اس شرط سے چھوڑ دیا گیا تھا کہ اگر ٹرکی نے معاہدے کی کسی شرط کی خلاف ورزی کی تو وہ (قسطنطنیہ) ضبط کر لیا جاوے گا۔ ٹرکی نے، اصل معنوں میں، شتلجا کی لائن کے مغرب میں جتنا بھر تھریس تھا، نیز ٹینے ڈوس، امبروس اور ایجی آن کے وہ تمام جزیرے، جو یونانیوں کے قبضے میں تھے، یونان کے حوالے کر دیے تھے۔ لیکن یونان کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ ان جزائر کو قلعہ بند کرے، جو آبناے کے متصل ہیں؛ اور اس سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ اس کو ایک معاہدے پر دستخط کرنے پڑیں گے جس کے موافق وہ (یونان) اپنی سلطنت میں جو ترک

تھوڑی تعداد میں رہ گئے ہیں اُن کے حقوق کی حفاظت کرے گا۔ سمرنا اور اُس کے ارد گرد جتنا چھوٹا سا علاقہ تھا اور جس میں آیڈین کی نصف ولایت شامل تھی پانچ برس تک ٹرکی کے زیرِ حکومت یونان کے زیرِ نظم و نسق رہنے والا تھا اور اس کے بعد اگر وہاں کے باشندے راضی ہوں تو یونان سے ضم کر دیا جاوے گا۔ عراق عرب، شام، فلسطین، آرمینیہ اور حجاز آزاد ریاستیں تسلیم کر لی گئیں۔ ان میں سے پہلی تین ریاستیں علم برداری میں رہنے والی تھیں۔ کردستان کو حکومت خود اختیاری مل گئی۔ کاسٹیلوریزو اور سپوراڈی جزائر میں سے بارہ چھوٹے جزیرے، جن پر ۱۹۱۲ء کی جنگ میں اٹلی نے قبضہ کر لیا تھا اُسی کے پاس چھوڑ دیے گئے۔ برطانیہ کی مصر پر حفاظت اور قبرص پر قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ فوج کے متعلق اس معاہدے میں جو دفعات تھیں اُن میں سے بڑی دفعہ یہ تھی کہ ٹرکی کوئی فوج سوائے سلطان کے باڈی گارڈ کے نہ رکھ سکے گا؛ اور اس باڈی گارڈ میں قریباً سات سو آدمی ہوں گے اور کچھ جنڈرمہ؛ سرحد کی حفاظت کے لیے جو فوج ہوگی اُس کی تعداد پچاس ہزار سے تجاوز نہ کرنے پاوے گی۔

اس کے یہ معنی تھے کہ اس حیرت انگیز عہدنامے کے مطابق سلطنت عثمانیہ اپنی دو تہائی سلطنت اور تین چوتھائی آبادی سے محروم کر دی گئی تھی۔ چار لاکھ چالیس ہزار مربع میل کا رقبہ ارضی اور بارہ ملین سے زیادہ آبادی ترکوں کے ہاتھ سے نکال لی گئی تھی؛ بہ تبدیل الفاظ قریباً آٹھ ملین ترک ایسے علاقے میں بند کر دیے گئے تھے جس کا رقبہ ضلع کیلیفورنیا کے برابر تھا، اور جس کا کوئی راستہ صحیح معنوں میں سمندر کی طرف نہیں تھا۔ باوجود اتحادیوں کے بار بار وعدوں کے کہ یہ لڑائی فتوحات کے لیے نہیں لڑی گئی تھی اور اس سے حدودِ سلطنت بڑھانی مقصود نہیں تھی، یہ ناقابل انکار امر موجود رہا کہ بہت سے وہ حدود ارضی جن سے ترک محروم کر دیے گئے تھے علم برداری، محافظت، حدود واثر، رقبۂ مقبوضہ، بین الاقوامی رقبہ یا حقوقِ ضم شدہ کے نام پر بیس اتحادیوں کی قوموں کے ہاتھ میں پہنچ گئے۔ شاید ایسی مکارانہ اور روز روز کی فساد انگیز دستاویز دنیا میں کبھی کسی کاغذ پر نہیں لکھی گئی ہوگی۔

پیرس، لنڈن، سین ریمو، سپا اور سیورے میں اتحادیوں کو اس سودے پر لڑتے اور دلالوں کی سی باتیں کرتے ہوئے چھوڑ کر یہ دیکھنا چاہیے کہ ٹرکی میں کیا ہو رہا تھا۔ ترکوں کے لیے یہ زمانہ بہت ہی بھاری گزر رہا تھا۔ اُن کا ملک بے دست و پا و لاچار، عاجز ہو کر فاتحوں کے قدموں کے نیچے روندا جا رہا تھا۔ دردانیال پر جو مقامات فوجی نقطۂ نظر سے اہم تھے وہ اتحادیوں کے تصرف میں تھے؛

اتحادیوں کے کچھ جہاز مارمورا میں گشت لگا رہے تھے اور کچھ گولڈن ہارن کے بندروں پر لنگر ڈالے ہوئے تھے؛ اتحادیوں کی فوجِ محافظ قسطنطنیہ میں خیمہ زن تھی؛ دارالسلطنت میں فوجی حکم جاری تھا، جو سخت نامعقول اور رعایا کو پیس ڈالنے والا تھا۔ شاید جرمنوں نے فرانس اور بلجیم میں بھی اتنی سختی نہ کی تھی، جیسی اس وقت یہاں ہو رہی تھی۔ ہر قسم کی تحریرات پر احتساب اپنے پورے زوروں پر تھا؛ زبان پر قیود تھیں؛ اخبارات میں کچھ لکھنا یا اُن کو پڑھنا ممنوع تھا؛ خفیہ طور پر گرفتاریاں ہونا اور ملک بدر کیا جانا روزمرہ کا معمول ہو رہا تھا۔ اتحادیوں کی پولیس اور اُن کے جاسوس ہر جگہ موجود تھے۔ دارالسلطنت کے اُس محلّے میں جو پیرا کے نام سے موسوم ہے، یونانیوں اور ارمنیوں نے ترکی ٹوپیاں اُتار کر یورپین ٹوپیاں زیب سر فرمالی تھیں اور وہ جوش میں بیخود گلی گلی گشت لگا رہے تھے۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے شروع ہی میں یونانی اور ارمنی بطریقوں نے اپنے تعلقات عثمانی گورنمنٹ سے توڑ دیے تھے اور اپنے اپنے مقلدین میں اعلان کر دیا تھا کہ اب وہ ترکی رعایا نہیں رہے۔ ترکوں کی پارلیمنٹ اب بھی استنبول میں اجلاس کر رہی تھی، مگر مردہ دلی، بے حسی اور نا اُمیدی کی حالت میں۔ بابِ عالی میں ہر چیز پر اُداسی چھائی ہوئی تھی اور ہر بات سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ سلطان محمد ششم شفیق، نیک دل اور کمزور طبیعت کے معمر آدمی تھے اور تنہا یلدیز میں رہتے تھے۔ سلطنت کا (بلکہ صحیح طور پر یہ کہنا چاہیے کہ سلطنت کے اُن ٹوٹے پھوٹے ٹکڑوں کا، جو باقی رہ گئے تھے) نظم و نسق وزیر اعظم، داماد فرید پاشا کے ہاتھ میں تھا۔ یہ بڑے ہوشیار، فہیم، اور غیر محتاط سیاسی شخص تھے۔ اگر وہ برطانیہ کے ہاتھ بکے ہوئے نہ تھے تو کم از کم ان کے دست پروردہ ضرور تھے۔ باسفورس کے اُس طرف کئی مقامی حفاظتی چیزیں ایسی پیدا ہو گئی تھیں جو ایشیاء کوچک کی طرف کی چھوڑی ہوئی سرحد کی نگرانی کرتی تھیں، کیوں کہ یہ اندیشہ تھا کہ شاید کوئی اتحادیوں کے جہازوں کی نظر بچا کر اُدھر سے حملہ کر دے۔

قوم بھر کے معاملات زیر و زبر ہو رہے تھے اور ایک آفت برپا تھی؛ یکایک اس تماشا گاہ پر ایک ایسا نیا ایکٹر آ نا ہر کہ اُس جیسا طاقتور اور لائق ایکٹر ایشیا نے پچھلی نسل میں پیدا نہیں کیا۔ یہ شخص فوراً ہی دنیا کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایسے آدمی دنیا میں ہو گزرے ہیں جن کے نام تاریخ میں اس حیثیت کے ساتھ درخشاں ہیں کہ وہ اپنے ملک اور اپنے آدمیوں کے ناجی تھے؛ مجھے یقین کامل ہے کہ اس ایکٹر، مصطفٰے کمال، کا نام ان ہی ناجیوں کے نام کے ساتھ ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ یہ سالونیکا میں پیدا ہوئے اور سپاہیوں کا پیشہ اختیار کیا؛ اپنی ذاتی قابلیت سے

جلدی جلدی ترقی کرکے ایک ڈویژن کے جنرل اور جنرل سٹاف کے ممبر ہوگئے۔ جب انور نے سالونیکا میں انجمن اتحاد و ترقی قائم کی تو چوں کہ کمال نہایت دل سوز محب وطن تھے اور ناانصافی اور ظلموں کو دیکھ دیکھ کر حب الوطنی کی آگ میں پھنکے جاتے تھے اس لیے وہ نوجوان ترکوں میں جا شامل ہوئے۔ وہ ۱۹۰۹ء کی اُس بغاوت میں شامل ہوئے جس نے سلطان عبدالحمید خاں (مرحوم) سے تخت چھڑایا۔ لیکن جیسے ہی اُنھیں معلوم ہوا کہ انور اور اُن کے رفیق، سلطان معزول (مرحوم) کی پالیسی پر دوسرے نام سے عمل پیرا ہیں، تو وہ اُن سے الگ ہوگئے۔ گیلی پلی کی مہم کے موقعے پر کمال ایک ڈویژن کے کمانڈر تھے اور اُس وقت کی خدمات کی وجہ سے قومی ہیرو بن گئے تھے۔ لیکن اُن کی ہر دل عزیزی کی وجہ سے انور کو، جو اس وقت ترکی میں کُل کُلاں بنے ہوئے تھے اُن سے رشک پیدا ہوا اور کمال کو ایک ڈویژن کے بعد دوسرے ڈویژن سے موقوف کیے جاتے رہے آخر وہ ایشیا کوچک میں نظر بند کردیے گئے۔ وہ اُس زمانہ میں تھے کہ انور کی پالیسی کے موافق بار بار جارحانہ حملے کیے گئے۔ جن کا یہ تلخ انجام ہوا جو اس وقت نظر آرہا ہے۔ کمال اس کی کئی بار پیشین گوئی کر چکے تھے۔ جب ۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو مُدرانیا میں التوائے جنگ کے عہد نامے پر دستخط ہوئے، تو انور اور اُن کے رفیق ممبران اتحاد و ترقی دارالسلطنت سے اپنی جان بچا کر بھاگے، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اتحادیوں کے ہاتھوں اُن کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ اُس وقت کمال قسطنطنیہ میں واپس آگئے۔

اس درہم و برہم شدہ شہر میں جو کچھ اُنھوں نے آکر دیکھا اور سنا اُس سے اُن کی یہ رائے اور بھی پختہ ہوگئی کہ اگر ایشیائے کوچک کو، جو ترکوں کا تاریخی وطن تھا، دشمنوں نے اُس کیا طرح معاف نہیں کیا، جو اب سے چند روز پیش تر ترکوں کی سلطنت تھی، تو ترکوں کو خود یہ کام کرنا پڑے گا۔ جب امریکہ نے مشرق قریب کے معاملے میں دست اندازی کرنے سے انکار کردیا، تو ترکوں کی یہ امید کہ کوئی غیر سلطنت اُن کی مددگار ہوگی، بالکل ٹوٹ گئی۔ اگرچہ شرائط صلح اب تک شائع نہیں ہوئے تھے، مگر اس بات سے سب واقف تھے کہ اتحادی تصد مصمم کر چکے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ کے پرخچے اُڑا دیں گے۔ پریزیڈنٹ ولسن نے اپنے چودہ [۱۴] قرارداد صلح میں جو یہ بالمعنی وعدہ کیا تھا کہ ایشیائے کوچک ترکوں کے پاس چھوڑ دیا جائے گا، اُس سے یوں مایوسی ہوئی کہ یہ افواہ سُنی گئی کہ اس بلا شرکت غیرے ترکی علاقے پر یونان کا دانت ہے اور وہ اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کردینا چاہتا ہے۔ یہ افواہ غلط نہ تھی، جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کردیا۔ ترکی میں کوئی گورنمنٹ ایسی نہیں رہ گئی تھی

کہ اُس کے جھنڈے تلے جمع ہو کر مقابلہ کیا جا سکتا ۔ یہ صحیح ہے کہ اُس وقت بھی پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا تھا، لیکن اُس پر وہ آزاد خیال گروہ قابض تھا جو یہ چاہتا تھا کہ صلح ہو جائے، خواہ اُسکی کچھ ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے ۔ یہ گروہ 'یا فریق' وزیر اعظم داماد فرید کی مٹھی میں تھا اور داماد فرید، برطانیہ کا دست پروردہ تھا ۔ اگر سلطانِ وقت زوردار شخصیت کے آدمی ہوتے، تو وہ بحیثیت خلیفۂ اسلام اپنے اختیارات کو کام میں لاکر کوئی صورت پیدا کر دیتے (جس کی اشد ضرورت تھی) اور وہیں سے تباہ شدہ ملک کے لیے کوئی بہتری کی صورت پیدا ہو جاتی، لیکن پارلیمنٹ کی طرح، سلطان محمد ششم بھی بالکل داماد فرید کی اور اُن کے ذریعے سے برطانیہ کی مٹھی میں تھے ۔

کمال نے فوراً تاڑ لیا کہ اناطولیہ، یا فی الحقیقت ٹرکی کی آزادی کے نام و نشان کو بچا لینے کی اگر کوئی امید ہے تو صرف اس میں کہ مقامی محب وطن انجمنوں کو ایک ایسا سیاسی گروہ بنا لیا جائے کہ وہ پارلیمنٹ کے آزاد گروہ کو معزول کر کے تمام پارلیمنٹ پر قبضہ کر لے ۔ اسکے بعد یہ ہو سکے گا کہ داماد فرید پاشا کو معزول کر کے برطانیہ کی من مانی پالیسی کا خاتمہ ہو جائے اور ترکوں کے موافق پالیسی قائم ہو جائے ۔ لیکن کمال کو بالکل صاف طور پر نظر آ رہا تھا کہ جب تک اتحادیوں کی فوج قسطنطنیہ پر قابض ہے وہ خود اور اُن کے رفقاء اپنی تدابیر کو پورا کرنے کے لیے شہر میں محفوظ نہیں رہ سکتے ؛ کیوں کہ وہ روزمرہ یہ دیکھتے تھے کہ سینکڑوں وہ ترک جن پر برطانیہ کے خلاف ہونے کا شبہ بھی ہوتا تھا، راتوں رات گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیے جاتے تھے ۔ یہاں مجھے مختصر الفاظ میں یہ کہہ دینا چاہیے کہ انسداد و انتزاع کا یہ سخت اور غیر منصفانہ طریقہ، جو برطانیہ نے اُس وقت مرعی رکھا تھا، بالکل ناقابل فہم اور بے اثر تھا ؛ کیوں کہ بجائے اس کے کہ اس سے انگریزوں کے خلاف ترکوں کے ارادوں کو بالکل ملیا میٹ کر ڈالا جائے، اُن کی مخالفت اور بھی بڑھتی چلی جاتی تھی ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ظلم و جبر سے آدمی عارضی طور پر ہار مان لے اور بہ ظاہر تابع داری دکھلا دے، لیکن تاریخ ایسی بہت سی مثالیں پیش کرتی ہے کہ اس کا آخری انجام یہ ہوتا ہے کہ یہ چنگاری سُلگ سُلگ کے ایک بڑا الاؤ بن کر ملک بھر میں غدر و بغاوت کی آگ بھڑکا دیتی ہے ۔

بہر کیف، معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت قسمت کمال کا ساتھ دے رہی تھی ؛ کیوں کہ سنہ ۱۹۱۹ء کے موسم بہار کے شروع ہی میں وزیر جنگ نے اُن کو اس غرض سے ایشیائے کوچک میں بھیج دیا کہ وہ وہاں فوج کے ہتھیار لے لینے میں مدد کریں ۔ جیسے ہی فرید کو اس کی اطلاع ملی کہ کمال روانہ ہو گئے تو اُن کو اپنے وزیر جنگ کی غلطی پر تنبہ ہوا، اور اُن کے وہاں جانے کے جو نتائج ہونے والے تھے

وہ نظر آنے لگے۔ اُنھوں نے فوراً کمال کو حکم دیا کہ وہ فی الفور دارالسلطنت میں واپس آجائیں۔ کمال کو خیال ہوا کہ اس حکم کے معنی مالٹا کے خاردار تاروں میں قید ہونا ہے؛ اس لیے اُنھوں نے بڑی سختی کے ساتھ تعمیلِ حکم سے انکار کر دیا۔ چوں کہ فرید، سلطان کی گورنمنٹ کے حاکمِ اعلیٰ تھے اس لیے اُن کے حکم کی تعمیل نہ کرنا خود سلطان کی نافرمانی تھی اس طرح کمال گویا اپنے بادشاہ کے باغی ہو گئے۔

اب اناطولیہ بدترین کشاکش کا اکھاڑا بن گیا؛ ایک طرف کمال اور ان کے طرفدار تھے اور دوسری جانب فرید اور اُن کے حمایتی۔ صوبوں کے وہ حکام، جو فرید کے وفادار تھے، کمال کے آدمیوں کو پکڑ کر قسطنطنیہ بھیجنے لگے؛ جو لوگ بچے اُنھوں نے مشرقی صوبوں میں فرید کے آدمیوں کے ساتھ وہی سلوک کیا۔ ٹرکی، اپنی اس بدترین حالت مظلمہ میں، گویا دو اکھاڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان میں سے ایک گروہ، جو فرید کی سرکردگی میں تھا، اپنے آپ کو فریقِ خلافت کہتا تھا۔ ان میں وہ لوگ شامل تھے جو خوف یا لالچ کے مارے یہ چاہتے، اور اسی پر زور دیتے کہ ٹرکی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اتحادیوں کے رحم و کرم کے حوالے کر دے۔ یعنی جو قیمت بھی دینی پڑے دے کر صلح کر لے۔ دوسرا گروہ، جس کے سرکردہ مصطفیٰ کمال تھے، قومی فریق کہلانے لگا۔ اس فریق میں ٹرکی کے بہترین آدمی شامل تھے۔ طالبانِ علم، عقیل و فہیم لوگ، پرانی بری و بحری فوج کے افسر، پیشہ ور، تاجر اور دہقین؛ سب کے سب جوشِ حب الوطنی سے سرشار تھے اور قصدِ مصمم کیے ہوئے کہ جس طرح ہوگا اپنی آزادی کو قائم رکھیں گے، خواہ اس کی کوئی بھی قیمت دینا پڑے۔

اس موقعے پر یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ جب ۱۹۱۹ء کے موسمِ بہار میں مصطفیٰ کمال اناطولیہ واپس آئے ہیں اور اُنھوں نے اپنی قومی تحریک شروع کی ہے تو اُن کا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ عہدنامہ مدانیا کی خلاف ورزی کریں۔ وہ اس ارادے سے وہاں گئے ہی نہ تھے کہ اتحادیوں کا شمشیر بکف ہو کر مقابلہ کریں، یا یہ کہ قسطنطنیہ کی باضابطہ گورنمنٹ کے خلاف ایک رقیب گورنمنٹ بنا دیں۔ وہ اس غرض سے گئے تھے کہ ایک نیا سیاسی گروہ بنا دیں، جو اتنا قوی ہو کہ ترکی پارلیمنٹ پر قبضہ کر سکے، جس میں نمک حرام اور دشمنانِ ملک و ملت بھرے ہوئے تھے، اور اس ذریعے سے اتحادیوں کا مقابلہ کر کے اُن کی یہ تدبیر نہ چلنے دیں کہ ٹرکی کے حصے بخرے کر دیے جائیں۔ لیکن جب ماہ مے ۱۹۱۹ء میں یہ خبر پہنچی کہ یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کر کے نہتے ترکوں کا قتلِ عام کر دیا ہے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ایشیائے کوچک پر بجلی گری، اور تمام صوبے گویا مصطفیٰ کمال کے جھنڈے تلے ٹوٹ پڑے اور ان کی پالیسی طرفۃ العین میں بدل گئی۔

یہ بات اب تک نہ کسی نے بتائی ہے، نہ سمجھ میں آئی ہے کہ آخر اتحادیوں کو کیا سوجھی کہ اُنھوں نے یہ احمقانہ فعل کیا کہ یونانیوں کو اپنی فوجوں سے مدد تو دی نہیں اور اُن سے کہہ دیا کہ اناطولیہ جیسے علاقے پر حملہ کر دو، جہاں ترکوں کی آبادی بہت ہی زیادہ ہے۔ اُس وقت یہ کہا گیا تھا کہ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ مصطفےٰ کمال اور اُن کی نئی قومی غیر قواعد داں فوج کے سامنے یونانی فوج کا مظاہرہ کیا جائے، تاکہ وہ مرعوب ہو جائیں؛ کیوں کہ اُنھوں نے اتحادیوں کو تکلیف دینا شروع کیا تھا۔ لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ یہ ترکیب انگلستان اور فرانس کی تھی کہ اٹلی سے پیش دستی کریں، کیوں کہ اُس (اٹلی) کو ترکوں کے ملک کی لوٹ میں سے جو حصہ ملا تھا وہ اُس پر راضی نہ تھا اور یونانیوں کی جو طمع ایشیاء کوچک میں نظر آ رہی تھی اُس سے وہ بہت ہی ناراض تھا؛ اس لیے یہ دونوں یہ خفیہ چال چلے کہ یونان سمرنا پر یکایک قبضہ کر لے اور پھر اتحادیوں سے یہ کہہ دیا جائے کہ جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا، اب یہ بدلا نہیں جا سکتا۔ بہر حال اس قبضے کے لیے جو کچھ بھی حیلہ بنایا جاتا، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اتحادیوں نے یونانیوں کو اپنا آلۂ کار بنایا، اور صرف یہی نہیں بلکہ یونانی سپاہیوں نے شہر کے غیر مصافی نہتے باشندوں کا قتل عام کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصطفےٰ کمال نے عہد نامۂ التواءِ جنگ کو پھاڑ چیر کر پھینک دیا۔ اس سب نے مل کر ترکوں کی دبی ہوئی قومیت کی آتش غیظ و غضب اور حب الوطنی کو ایسا بھڑکایا کہ ایشیاء کوچک کو مارمورا کے کنارے سے کردستان کی پہاڑیوں تک گرم و روشن کر دیا۔

قسطنطنیہ کی گورنمنٹ اور قومی فریق میں جو نفاق پیدا ہو گیا تھا وہ اور بھی بڑھ گیا۔ ۱۱ر جولائی ۱۹۱۹ء کو فرید نے مصطفےٰ کمال کے باغی ہونے کا اعلان کر کے اُس کے خلاف تھوڑی سی فوج بھیج دی۔ اناطولیہ کے دہقین کی طبیعتوں میں فرماں برداری اور تعلیم پذیری کا مادہ ہے اور اُن کے دل ایک ہی سمت میں کام کرتے ہیں۔ اب تک یہ لوگ سیاسیات میں کوئی دخل نہ دیتے تھے اور ان مسائل کو اُنھوں نے سیاست دانوں کے لیے چھوڑ رکھا تھا؛ لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ فرید کی فوج میں، (جس کا با شان و شکوہ نام "فوجِ خلافت" تھا) یونانی اور ارمنی بھی ہیں، تو اُن کو شبہہ پیدا ہوا اور اُنھوں نے کمال کا ساتھ دیا؛ گو اس سے اُن کی سلطان خلیفہ کی وفاداری میں نقص آ گیا، جو اتنے قدیم زمانے سے چلی آتی تھی، جتنی ترکی سلطنت ہے۔

سلطنت ٹرکی کی تجویزۂ تقسیم پر اظہار ناراضی اور یونانیوں کے خلاف تدابیر اختیار کرنے کے لیے ستمبر ۱۹۱۹ء میں ارض روم میں کمال نے ایک کانگریس منعقد کی جس میں اناطولیہ کی حمایت و حفاظت کی

تمام انجمنوں کے نمایندے شامل ہوے۔ اس کے دو مہینوں کے بعد ایک اور کانگریس منعقد کی گئی۔ اس مرتبہ اس میں تمام ایشیائی حصے کے منتخبہ لوگ شامل ہوے۔ اس کانگریس کا اجلاس سیواس میں ہوا اور وہیں قومی تحریک کی اصل بنیاد اس طرح پڑی کہ بارہ ارکین کی ایک قومی کونسل قرار دی گئی۔ یہ کونسل آنگورہ میں مسلسل اجلاس کرتی رہی۔ آنگورہ اور قسطنطنیہ کے درمیان میں آسانی کے ساتھ بہ ذریعہ تار برقی برابر مراسلت رہی۔ باوجود اس کے کہ فرید نے کمال کو باغی قرار دے دیا تھا، مگر قوم پرستوں نے ابھی تک عثمانی گورنمنٹ سے اپنا تعلق نہیں توڑا تھا۔ اس سال کے تمام موسم گرما و خزاں میں ہر حیثیت کے محبان وطن ترک، مع کثیر التعداد قومی فریق نمایندگان پارلیمنٹ، استنبول سے سیکڑوں بھیسوں میں، پیدل، گھوڑے پر سوار ہوکر اور ریلیوں میں بیٹھ کر انگورہ پہنچ گئے۔ اتحادیوں نے جو گھیرا ڈال رکھا تھا اسکو انھوں نے جس طرح ہو سکا، توڑ دیا۔ مصطفےٰ کمال پر اس نئے گروہ کے بنانے اور اس کے منظم کرنے کا بوجھ تو پڑا ہوا تھا ہی، مزید بار یہ بھی پڑا کہ جنگ کے اس تھکے ماندے، مفلس اور دور افتادہ حصۂ ملک سے انھیں ایک فوج بناتا اور اس کو مسلح کرتا تھا، تاکہ یونانیوں کو آگے نہ بڑھنے دیا جاوے۔ میرے ان الفاظ کو یاد رکھیے کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ جب اس نوجوان ترک راہ نما کے ان کارناموں کا ذکر، جو اس نے اناطولیہ جیسے سنسان قطعۂ ملک میں دکھلاوے، ان سیاست داں سپاہیوں کے ساتھ ساتھ کیا جاوے گا، جو اپنے ملک و قوم کے ناجی ہوے ہیں اور جن کی کمریں ایک قوم کی ذمہ داریوں کے بوجھ سے خم ہوگئی ہیں؛ بالکل یہی حال اس بطل اعظم کا تھا، جو اس وقت تمام ملک و ملت کے بوجھ سے خمیدہ کمر، ایک برف سے ڈھکی ہوی پہاڑی کی ایک گھاٹیوں میں بڑے غور و فکر میں ٹہل رہا تھا۔

فرید کا کوئی حمایتی ملک میں نہیں رہا؛ یہاں تک کہ بیچ کارہ پارلیمنٹ بھی اس کی نہ رہی۔ تاہم اس (پارلیمنٹ) کو اس نے اس لیے زندہ رکھ چھوڑا تھا کہ وہ اس کی تدبیروں (یا بدتدبیریوں) کا ایک قانونی ہیولیٰ بنا سکے؛ مگر بہت جلد یہ کیفیت ہوگئی کہ اس نے بھی فرید کے اشاروں پر ناچنا چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ قریباً سب کچھ جاتا رہا تھا مگر اس کے پاس بڑی چیز برطانیہ کی حمایت بہ دستور باقی تھی اور برطانیہ تھا کہ سیورے کے معاہدہ کا مسودہ گھڑنے میں مصروف تھا۔ ادھر یہ ہو رہا تھا، ادھر انگورہ کی قومی کونسل اپنا الٹی مے ٹم (اعلان آخر) دینے کی فکر میں تھی۔ یہ الٹی مے ٹم ایسے الفاظ میں ہونے والا تھا کہ جن سے یہ صاف ظاہر ہو جاوے کہ راستی نامے کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی؛ اگر تھی تو صرف ذیل کی شرائط، جن کو اگر اتحادی مان لیں تو ترکی اتحادیوں کے ساتھ صلح

کر سکتا تھا۔ یہ اقل و دل، پُرمغز دستاویز بہت جلد "قومی عہد و پیمان" کے نام سے مشہور ہونے والی تھی۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ٹرکی کی سیاسی، عدالتی اور اقتصادی آزادی کو، بلا کسی شرط کے تسلیم کیا جاوے اور تمام ایشیاء کوچک اور شرقی تھریس اُس کے قبضے میں چھوڑ دیے جاویں۔ یہ ٹرکی کی آخری شرط تھی؛ یہ ٹرکی کا آخری اعلان آزادی تھا۔ یہ عظیم القدر دستاویز فوراً قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ کو بھیج دی گئی اور وہاں فوراً ہی ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو منظور کرلی گئی۔ اس سے فرید کو جو کچھ پریشانی ہوئی ہوگی اُس کا بیان کرنا لاحاصل ہے۔ برطانیہ نے اپنی دست پروردہ کٹ پتلی کو بچانے کے لیے قدم آگے بڑھایا، اور اُس نے وُہی من مانی ترکیبیں چلیں جو مصر، آئرلینڈ وغیرہ میں چل چکا تھا۔ ۱۱ اپریل کو برطانیہ نے ترکی پارلیمنٹ توڑ دی اور اُس کے تقریباً چالیس اراکین اور قریباً ایک سو ایسے آدمیوں کو، جو قومی تحریک کے ہم زبان تھے، گرفتار کرکے مالٹا جلا وطن کر دیا۔ اس سے زیادہ تنگ نظرانہ کارروائی قیاس میں بھی نہیں آسکتی؛ کیوں کہ قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ کا توڑا جانا وہ بات تھی جس کو قوم پرست خدا سے چاہ رہے تھے۔ اُنھوں نے یہ سنتے ہی انگورہ میں فوراً ایک نئی پارلیمنٹ قائم کرلی؛ اور انگورہ وہ مقام تھا جہاں تک کسی غیر ملک کی دست اندازی یا دھمکی کام نہیں کر سکتی تھی؛ اس طرح انگریزوں نے گویا اپنے ہاتھ سے مقام حکومت و اختیارات کو باسفورس کے کنارے سے قلب اناطولیہ میں پہنچا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ کو جو قابو ٹرکی کی گورنمنٹ پر حاصل تھا وہ اس نے کھو دیا، اور قوم پرستوں کو خود وہ موقعہ دے دیا جس کے وہ آرزومند تھے اور جس سے اُنھوں نے فوراً فائدہ اُٹھایا۔

قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ کو بہ جبر توڑنے سے قوم پرست گروہ ایشیاء کوچک میں گویا اپنے پورے شباب پر آگیا اور اُس نے اس واقعے کے بارہ ہی دن بعد، ۲۳ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء کو، ایک نئی پارلیمنٹ بہ نام نہادِ "مجلس ملیۂ اعظم" بہ صدارت مصطفےٰ کمال کھول دی۔ اس مجلس ملیہ کا سب پہلا قدم یہ تھا کہ اُس نے فی الفور یہ اعلان کر دیا کہ "ٹرکی میں اصل اور باضابطہ گورنمنٹ وہ ہے جس کو یہ مجلس تسلیم کرے؛ چنانچہ یہ مجلس اپنے آپ کو، موافق قانون مروجہ وقت صحیح گورنمنٹ قرار دیتی اور تمام عاملانہ اور وضع آئین و قوانین کے اور عدالتی اختیارات اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔" اگرچہ یہ مجلس، محض براہ نام ونمود، خلیفہ اسلام کی وفادار رہی، مگر دنیاوی اختیاراتِ شہنشاہ و سلطان ٹرکی کو اُس نے بالکل ختم کر دیا۔ یوں وہ سلطنت ختم ہوگئی جو عثمان سے شروع ہوکر چھ سو برس سے اب تک نسلاً بعد نسلٍ ایک ہی خاندان میں چلی آتی تھی۔[1]

---

[1] شاید یہاں یہ کہہ دیا جانا زیادہ موزوں ہوتا کہ ان سلاطین کی جگہ ٹرکی نے ایک نیا جنم لیا۔ (مترجم)

اس قومی مجلس نے اپنے پہلے ہی اجلاس میں دو دستور العمل (ایکٹ) بنا دیے، جن کی وضع ہی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس نئی حکومت کی صورت، مقصود اور کام کیا ہوگا۔ ان میں سے پہلے ایکٹ میں اُس قومی عہد و پیمان کی تصدیق و توثیق کی گئی جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں اور وہی جدید ٹرکی کا اصل اصول حکومت قرار پایا۔ دوسرے ایکٹ کے مطابق کانسٹی ٹیوشنل لا قرار پایا۔ یہ لا تمام دنیا میں یکتا ہے؛ اس کے موافق ترکوں میں نہ مانرکی[صہ] ہے، نہ ری پبلک[صہ]، نہ کوئی بادشاہ ہے، نہ پریزیڈنٹ۔

۱۱ مے کو اتحادیوں نے سیورے کا عہدنامہ بہ ہمہ نوع مکمل کر کے فرید کے پاس بھیج دیا اور ان کو حکم دیا کہ جس قدر جلد ہو سکے اس کی اپنی گورنمنٹ سے منظوری لے دیں۔ میں پہلے بھی کہیں کہہ چکا ہوں کہ اس معاہدے کے مطابق تمام یوروپین ٹرکی، قسطنطنیہ کے خط تک، یونان کو دی جانے والی تھی؛ جس کے معنی تھے کہ یونانیوں کی سنگینیں ایا صوفیہ کی مسجد کے میناروں سے نظر آ سکتی تھیں؛ اس کے علاوہ سلطان اپنے باڈی گارڈ میں سو آدمیوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتے تھے؛ آبنائے کے دونوں طرف ایک وسیع علاقہ چھوڑا جانے والا تھا، جو بین الاقوامی ماتحتی میں رہتا؛ آرمینیہ، سلیشیا اور سمرنا نکال لینے کے بعد ایشیاء کوچک کا جو حصہ رہ جاتا وہ دوامًا اتحادیوں کے فوجی، مالی اور اقتصادی انتظام میں رہتا۔

قسطنطنیہ میں کوئی پارلیمنٹ تو رہ ہی نہیں گئی تھی، مگر فرید اپنے دل و دماغ کو کسی قانون کی پابندی کی تکلیف نہیں دیا کرتے تھے۔ انھوں نے فورًا اپنی بڑے بڑے نام و نمود کے ترکوں کو، جو اُن کے ہم زبان تھے، یلدیز کوشک میں بلا بھیجا کہ وہ اس معاہدے کو منظور کر کے اُس کی توثیق کر دیں۔ وہاں جو کچھ کارروائی ہوئی وہ بالکل خلافِ ضابطہ تھی، مگر فرید اپنے برطانوی آقاؤں سے کہہ سکتے تھے کہ "دو دوستوں کے درمیان قانون و ضابطے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" انھوں (فرید) نے اس عہدنامے پر کسی بحث کی اجازت نہیں دی اور یہ حکم دیا کہ جو لوگ اس معاہدے کے موافق ہیں، وہ کھڑے ہو جاویں۔ چوں کہ اُن کو معلوم تھا کہ اس معاملے میں اتفاق راے نہ ہوگا اور فتنہ و فساد پیدا ہو جاوے گا اس لیے انھوں نے سلطان کے کان میں کہہ دیا کہ "حضور بھی کھڑے ہو جاویں۔" سلطان محمد ششم ہزار کمزور اور غیر مستقل طبیعت کے آدمی تھے، مگر تھے تو پادشاہ، ظل اللہ اور خلیفۃ الاسلام؛ وہ کھڑے ہوئے تو تمام حاضرین اُن کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ بس یہ عیار وزیر اعظم صاحب اتنی

صہ Monorchy بادشاہ کی حکومت۔ صہ Republic یا جمہوریہ

ہی بات تو چاہتے تھے؛ اُنھوں نے فوراً اس کا اعلان کر دیا کہ اس عہد نامے کو سب نے - یہاں تک کہ سلطان نے بھی - متفقہ طور پر کھڑے ہو کر مان لیا۔ مگر ایک گرگ باراں دیدہ، بوڑھے سپاہی، فیلڈ مارشل علی رضا پاشا نے فوراً کانپتی ہوئی آواز میں فرید کو ٹوکا اور کہا کہ تمام حاضرین اس معاہدے کی توثیق کے لیے نہیں، بلکہ سلطان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے تھے؛ نیز یہ کہ اس انجمن کو اس مسئلے کے فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا، اور اگر حق ہوتا بھی تو وہ اس معاہدے کو اس وقت تک منظور نہیں کر سکتے، جب تک کہ وہ پارلیمنٹ جو انگورہ میں ہے منظور نہ کرے۔ اُنھوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ تمام ایشیاءِ کوچک اسی معاہدے کے خلاف بغاوت کیے ہوئے ہے۔ لیکن فرید پر جو علم اس کے آقا نے دیا تھا، اُس کی تعمیل فرض تھی، اُس نے پھر بہ آوازِ بلند یہی کہا کہ "جہاں تک میرا تعلق ہے اس معاہدے کو سب نے منظور کر لیا ہے؛ باقی رہا ایشیاءِ کوچک وہ جہنم میں جائے!" اگرچہ اس معاہدے پر ۱۰ اگست ہی کو فرید کے بھیجے ہوئے دو نمایندوں نے دستخط کر دیے تھے، مگر یہ بات بالکل صاف ظاہر ہو گئی کہ اس کی توثیق انگورہ کی مجلس ملی ہرگز نہیں کرے گی اور ترکی کی اصل گورنمنٹ وہی تھی۔[1]

اس نے اتحادیوں کو سخت پریشانی اور اضطراب میں ڈال دیا۔ انگلستان، فرانس اور اٹلی چار برس کی لڑائی سے تھک چکے تھے؛ نہ اُن کے پاس اتنے آدمی رہ گئے تھے، نہ اتنا روپیہ کہ وہ اندرون اناطولیہ میں ایک محب ملک، جنگ جو اور مرنے مارنے، آزادی لینے پر تہیہ کیے ہوئے لوگوں سے اُن ہی کے ملک میں ایک ایسی طویل جنگ میں پڑ جائیں جس میں بہت زیادہ خرچ تھا۔ اس کے علاوہ اُن ملکوں کی گورنمنٹ نے بہت جلد یہ معلوم کر لیا کہ وہاں کی رائے عامہ بڑی سختی کے ساتھ یہ تھی کہ ایسے جھگڑے میں پھنسنے کا اقدام نہیں کرنا چاہیے۔ اصل بات یہ تھی کہ مغربی یورپ کے لوگوں کو جنگ سے کافی سابقہ پڑ چکا تھا، وہ تھک چکے تھے۔ جب یہ امر صاف ظاہر ہو گیا کہ یورپ کی کوئی بڑی سلطنت، ترکوں کو سزا دینے کی مہم کو اختیار نہیں کرنا چاہتی، تو یونانیوں کے وزیر وینی زے لوس نے یہ دیکھا کہ اُس کو جو فوائد اس جنگ سے حاصل ہوئے ہیں اور جو ملک اُس کو ملے ہیں، وہ معرض خطر میں

[1] مقابلہ کیجیے غرناطے کے اُس واقعے سے جب ابو عبداللہ آخری تاجدارِ غرناطہ کو عیسائیوں کے حوالے کرنے پر تیار ہو گیا تھا تو ایک جنرل بزدل بادشاہ سے یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ مجھ سے یہ گوارا نہ ہوگا کہ مسلمان ذلت کے ساتھ مارے جائیں اور ان کی خواتین کی بے عزتی کی جائے، وغیرہ وغیرہ (مترجم)

[2] اس خصوص میں مسٹر کلیر براوس کے مضامین رسالۂ "کرنٹ ہسٹری" میں ملاحظہ فرمائیے۔

ہیں: اس لیے اُس نے یہ اعلان کیا کہ وہ ترکوں کو زیر کرنے کی مہم اپنے سر لینے کو تیار ہے۔ اب کیا تھا؛ لائڈ جارج نے بڑے جوش کے ساتھ اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اگر برطانیہ کو مغربی ایشیا میں اپنی اولوالعزمیوں اور بلند نظریوں کو پورا کرنا ہی تھا، تو وہ اس کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ پرانی عثمانیہ سلطنت کی قبر میں سے ایک نئی، متحدہ اور طاقتور ترکی پیدا ہو جائے؛ اس لیے اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ وینی زیلوس کی اس تجویز پر لائڈ جارج کی گورنمنٹ نے اتنا جوش دکھلایا۔ بہ قول "ایک بکواسی" کے جب تک یونان میں جان باقی تھی، برطانیہ ترکی قوم پرستوں سے لڑنے کو تیار رہتی۔

یہ بات اب تک ظاہر نہیں ہوئی کہ لائڈ جارج نے یونانیوں کی کس حد تک مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا؛ مگر اس میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اُس نے وینی زیلوس سے یہ وعدہ کرایا تھا کہ برطانیہ عظمیٰ اُس کو اخلاقی مدد دے گی؛ یہ یقین کر لینے کے بھی دلائل موجود ہیں کہ اُس نے اس پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ یونان کو روپے پیسے اور سامان حرب سے مدد دے گا۔

ناظرین نے شاید اس کو خیال کیا ہو گا کہ سنہ ۱۹۲۰ء کے شروع کے بعد کے جتنے واقعات میں نے بیان کیے ہیں، اُن میں، میں نے، ہر جگہ بہ جائے "اتحادیوں نے" "برطانیہ" لکھا ہے۔ میں نے یہ اس واسطے کیا ہے کہ اتحادیوں اور ترکوں کے درمیان جو جھگڑا تھا وہ اُس وقت کے بعد ترکوں اور برطانیہ کا ہو گیا تھا؛ کیوں کہ فرانس اور اٹلی، دونوں، لائڈ جارج کی قیادت سے اس لیے نکل گئے کہ اُن کو اُس کی پالیسی پسند نہیں تھی۔

فروری سنہ ۱۹۲۰ء میں قوم پرستوں کی فوجوں نے فرانس سے سلیشیا میں لڑنا شروع کر دیا تھا۔ یاد ہو گا کہ سائکس - پکاٹ کے عہد نامے کے مطابق یہ حصۂ ملک فرانس کو بخش دیا گیا تھا۔ اُنھوں نے فرانس کی فوج محافظہ کو شکست دے کر نکال باہر کیا۔ اور شہر مرعش پر قبضہ کر کے ارمنیوں کا قتل عام کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ارمنیوں نے ایک لیگ آف آرمینیہ قائم کر کے اپنے آپ کو فرانس کا معاون قرار دے لیا تھا اور ترکوں سے باغی ہو گئے تھے۔ ایک سال کی لڑائی کے بعد فرانس نے اس کو محسوس کیا کہ باوجود ترکوں کی مصمم مخالفت اور جنگ کے سلیشیا پر قبضہ رکھنے میں سوائے نقصان کے کوئی نفع نہیں ہے، تو وہ اس قطعہ ملک کو خالی کر دینے پر آمادہ اور اپنی "حکم برداری" کی حد کو بغداد ریلوے کے حدود تک محدود رکھنے کو خود بہ خود راضی ہو گیا۔ اس اثنا میں اٹلی نے جو یہ دیکھا کہ ایک طوفان خود اس پر ٹوٹنے والا ہے، تو وہ جلدی کر کے عدلیہ سے پیچھے ہٹ گیا۔

فرانس اور اٹلی نے قوم پرستوں سے من سمجھوتا کرلیا، تو اب ایک نئی بات نے دنیا کو محوِ حیرت کردیا؛ یعنی یہی دونوں سلطنتیں (فرانس اور اٹلی) ترکی کو یونان اور برطانیہ کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اسلحہ و آلات حرب پہنچانے لگ گئیں! فرانس نے صرف یہی نہیں کیا کہ اُس نے اپنے لیے جو ذخیرہ (اسلحہ و آلاتِ حرب کا) سابقاً جمع کیا تھا وہی قوم پرستوں کو دیا، بلکہ ہوا میں پرواز سکھانے کے لیے اپنے آدمی دیے۔ اس کے دو برس بعد تک فوجی ذخائر کی ایک نہر تھی کہ ترکی کی طرف جاری تھی، جو عدلیہ، مرسینا اور الگزینڈرٹیا کے راستے سے ہوتی ہوئی شام کی سرحد تک پہنچتی تھی۔ گمان تو یہ ہے کہ سوویٹ روس سے بھی یہ چیزیں آتی تھیں۔ جب مصطفےٰ کمال نے ۱۹۲۲ء کے موسم خزاں میں حملہ کیا ہے تو اکثر باتوں میں اُن کی فوج سامانِ حرب سے قریباً پوری طرح مسلح تھی۔

ایک سال کے بعد یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کرنے کے لیے ماہ مئی ۱۹۲۰ء میں خشکی پر شاہ کانسٹین ٹین کی ذاتی نگرانی میں پیش قدمی کی۔ برطانیہ کی فوجی کمیشن ساتھ تھی۔ قوم پرست آہستہ آہستہ پس پا ہوگئے۔ موسم گرما میں یونانی فوج اناطولیہ ریلوے کے دونوں طرف اسکی شہر سے کرا فیوم قرا حصار تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد دو برس برابر "بازی تمام" کی سی کیفیت رہی۔ اس نے ہوشیار و چالاک قوم پرست لیڈر کو اتنا موقعہ دے دیا کہ اُس نے اپنے بے پناہ ہتھیار پر ایشیائے کوچک کے ایک کونے میں بیٹھ کر صیقل کرلی۔

ابتدائے جنگ ہی میں ماہرین جنگ نے اس کو سمجھ لیا تھا کہ یونانیوں کے سپہ سالار نے لڑائی کا جو نقشہ بنایا ہے وہ بیہودہ ہے اور اس کا انجام شکست فاش کی صورت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ یونانی اندرونِ ملک میں بڑھے تو اُن کی فوجی قطاروں کی گنجانی میں کمی آنی شروع ہوگئی اور ان پر زد پڑنے لگی۔ اُن کو کامیابی ہوسکتی تھی تو صرف اس طرح کہ وہ ترکوں کی فوج کو گھیرے میں لیکر اس کو بالکل ختم کردیں۔ لیکن مصطفےٰ کمال بھلا یہ کب ہونے دیتے تھے۔ وہ پہلے ہی سے ہوشیار تھے۔ ازروئے فن حرب اُن کی حالت نہایت مضبوط تھی۔ اُن کے پس پشت ایک وسیع اور اُن کا خیر خواہ ملک تھا جس میں وہ بے تامل دُور تک پس پا ہوسکتے تھے۔ اُدھر یونانیوں کی یہ حالت تھی کہ وہ جتنا بڑھتے تھے اُن کو اپنے سامانِ حرب و ضرب کو آگے لے جانے میں دقت بڑھتی جاتی تھی اس وقت بھی اُن کی یہ حالت تھی کہ بوجھ سے اُن کی کمر ٹوٹی جاتی تھی۔

یونانیوں کے مقابلے میں ترکوں کی جو سپاہ تھی وہ ہوائی سامان، بھاری توپ خانے، ٹینک، موٹری سامانِ حمل و نقل اور زمانۂ حال کی ہر چیز کے لحاظ سے چوتھے درجے کی تھی، لیکن فوجی تجربے،

افسروں کے حکم ماننے اور بہادری میں دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ تمام فوج جنگ آزمودہ سپاہیوں سے مشتمل تھی۔ مصطفےٰ کمال کے اکثر آدمی بارہ برس سے قریباً مسلسل لڑ رہے تھے؛ اُن کی پھٹی پُرانی وردی کے سینے پر جو تمغے لگے ہوئے تھے، وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ پہلی یونان کی لڑائی، اٹلی کی لڑائی، بلقان کی پہلی اور دوسری لڑائی اور حجاز اور یمن کی بہت سی لڑائیوں میں لڑ چکے ہیں؛ وہ اُس فوج کے گل سرسبد تھے جسنے برطانیہ اور فرانس کو گیلی پولی سے نکالا تھا؛ جس نے عراق عرب میں برطانیہ کی فوج سے ہتھیار رکھوائے تھے؛ جس نے روسیوں کو قفقاز میں پس پا ہونے پر مجبور کیا تھا؛ جس نے فلسطین میں الینبی کے مقابلے میں معرکے جیتے تھے۔

ہم امریکی جو تعصب اور دَعائیہ سے اندھے ہو رہے تھے اور میدان جنگ سے پانچ ہزار میل پر بیٹھے ہوئے تھے، مصطفےٰ کمال اور اُن کے پیٹھے حال، چیتھڑے لگائے ہوئے، رفیقوں کو غدار، چھپ چھپ کر لڑنے والے جانور، اور باغی سمجھتے تھے، جو ایک منصفانہ اور خردمندانہ صلح کے راستے میں روڑے اٹکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم اُن کو خونخوار اور قزاق کہتے تھے؛ اُن کو اتنا ذلیل سمجھتے تھے کہ ان کا مقابلہ کرنا بھی ہماری ناک اور عزت کے منافی تھا؛ ہم کو اس امر سے سخت نفرت ہوتی تھی کہ وہ قوم جو شکست خوردہ، پٹی کُٹی ہوئی ہو اور جس کو یہ سزا دی گئی ہو کہ وہ اپنی شکست کا اس طرح تاوان ادا کرے کہ اُس کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاویں۔ اتنی گستاخ کیوں ہو کہ وہ اپنا سر اُٹھا سکے لیکن اُن کو جو کچھ کہیئے، یا سمجھیئے، امر واقعی تو یہ تھا کہ اناطولیہ والوں اور اُن "باغیوں" میں کوئی فرق نہ تھا، جو ڈیڑھ صدی ہوئی لیکسنگٹن[1] اور بنکرہل[1] میں لڑے تھے۔ یہ حقیر و ذلیل قوم پرست بھی اُسی غرض سے لڑ رہے تھے جس غرض سے ہمارے جد اعلیٰ لڑے۔ جتنی فوج واشنگٹن کے مقابلے میں تھی اُس سے ان قوم پرستوں کے مقابلے میں سو گنی زیادہ طاقتور فوج تھی۔ یہ "باغی" اور یہ قوم پرست دونوں ایک ہی مقصد کے لیے لڑے؛ یعنی حق حکومت خود اختیاری اور حصول آزادی کے لیے۔

۱۹۲۲ء کے موسم بہار تک ہر شخص کو صاف صاف معلوم ہونے لگا کہ اناطولیہ کی یہ "بازی قائم" زیادہ عرصے کے لیے جاری نہیں رہ سکتی؛ یا تو یونانیوں کو آگے بڑھنا چاہیے؛ یا واپس آجانا چاہیے۔ بس یا ہونے کے معنی اگر یہ نہ ہوں کہ یونانی اُن تمام فوائد سے محروم کر دیئے جائیں جو انھوں نے اس وقت

[1] ۱۷۷۵ء میں ان دونوں مقامات میں انقلاب امریکہ کے موقعے پر امریکیوں اور انگریزوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ انگریز ان محبان وطن امریکیوں کو "باغی" کہتے تھے، اور آج تک اسی نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس جنگ میں "باغیوں" ہی کو فتح ہوئی تھی۔ (مترجم)

ایشیائے کوچک میں کچھ علاقے لے کر حاصل کیے ہیں، تو یہ معنی ضرور تھے کہ یونانیوں کی شہرت و عزت ختم ہوگئی؛ وجہ یہ تھی کہ یونان کے بادشاہ اور اُس کے مشیروں نے اپنی رعایا کو اصل کیفیت سے بالکل نابلد رکھا تھا۔ ان لوگوں کو خوف ہوا کہ پسپا ہونے میں یہ سارا راز کھل جاوے گا اور پھر اپنے وطن اور غیر ممالک میں جو روسیاہی ہوگی وہ ظاہر تھی۔ لاچار، برطانیہ کی فوجی مشن کے اتفاق رائے یہ فیصلہ ہوا کہ اس نقصان اور بے عزتی کو ایک آخری کوشش کے داؤں پر لگا دیا جاوے اور جان توڑ کر ترکوں کا اس تہیے کے ساتھ مقابلہ کیا جاوے کہ قوم پرستوں کے مستقر پر قبضہ کر لیا جاوے۔ اس وقت کی کیفیت یہ تھی کہ ترک لڑائی سے پہلو بچانا چاہتے تھے؛ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۲ء کی بہار میں، اُنھوں نے اپنے ایک سفیر فتحی بے کو کچھ تجاویز لے کر لنڈن بھیجا تھا کہ اُن کو گورنمنٹ برطانیہ کے سامنے پیش کیا جاوے۔ میں سمجھتا ہوں کہ من جملہ اور تجویزوں کے ایک تجویز یہ تھی کہ آبناء سے فوج ہٹالی جاوے اور یونانی اناطولیہ سے ہٹا دیے جاویں۔ لیکن لائڈ جارج اور اس کا وزیر خارجہ، لارڈ کرزن (جو بڑا اور لایق ترین آدمی سمجھا جاتا تھا) بظاہر یونانیوں کی ڈھٹ بندی کے اخیر میں آئے ہوئے تھے، اُنھوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ فتح کامل یونانیوں کے ہاتھ میں آئی ہوئی ہے؛ دونوں نے ترکوں کے سفیر سے ملنے ہی سے انکار کر دیا؛ وہ غریب کئی ہفتے برطانیہ کے دارالسلطنت میں پڑا رہا اور آخر مایوس ہو کر انگورہ آ گیا۔ فتحی بے نے آ کر جو رپورٹ قوم پرستوں کے سامنے پیش کی اُس سے ان لوگوں کو صاف ظاہر ہو گیا کہ انھیں انگلستان سے رحم و کرم کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ لاچار و مجبور ہو کر مصطفیٰ کمال نے اپنے آخری اور سب سے بڑے حملے کی تیاری شروع کر دی۔

جب یونانیوں نے پیش قدمی شروع ہی کی ہو تو اُن کا اس وجہ سے دل بڑھا کہ اُنھوں نے قوم پرستوں کی فوج یسار کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا اور اُن کا سخت نقصان کر کے اُن کو پسپا کر دیا تھا۔ لیکن انگورہ سے قریباً پچھتّر میل پیچھے اور قریباً چالیس میل آگے، دریاء سقاریہ کے شمال و جنوب میں، مصطفیٰ کمال نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہاں یونانیوں نے پھر اپنی چالیں چلنی چاہیں؛ لیکن مصطفیٰ کمال نے اپنی فوج کو اُن پر ریل دیا۔ سقاریہ سے عبور کر کے کمال کی فوج کے جنوب میں یونانی ٹھیک مشرق کی طرف ترکوں کی فوج یسار کی تلاش میں بڑھے؛ مگر بیکار۔ اب ترکوں کی فوج مشرقی و مغربی لائن میں، انگورہ سے قریباً پچاس میل کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی؛ یونانی گھر گئے اور ایسے گھرے کہ اکیس دن تک اس گھیرے سے نکلنے کی جان توڑ کوشش کرتے رہے اور نہ نکل سکے۔ ایک وقت آنے والا ہے کہ یہ جنگ اور یہ کشش و کوشش دنیا کی فیصلہ کن لڑائیوں میں

شمار ہوگی۔ بہت جلد یہ ظاہر ہوگیا کہ ترکوں کی قوت کا بہت ہی کم اندازہ کیا گیا تھا؛ نیز یہ کہ یونانیوں کے سامان احمال و انتقال کو آگے بڑھنے میں اتنی مصیبت پڑ رہی ہے، جو قابل برداشت نہیں؛ اور سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ یونانی جہاں ہیں وہاں اب نہیں ٹھیر سکتے۔ اب کیا تھا! یونانیوں کی پس پائی شروع ہوگئی اور وہ اپنے پرانے مقام ایسکی شہر - افیوم قرہ حصار پر آگئے۔ اس پس پائی کے وقت یونانیوں کے سپہ سالار اعظم نے حکم دے دیا کہ اس موقعے پر جہاں جہاں سے سپاہی گزریں، اپنے دونوں طرف، ملک کو تباہ و برباد کرتے چلے جائیں۔ یہ وہی ترکیب تھی جو جرمنوں نے اس وقت اختیار کی تھی جب انھوں نے شمالی مشرقی فرانس کو خالی کیا تھا؛ بلکہ جرمنوں نے اتنا نہیں کیا تھا جتنا یونانیوں نے کیا؛ وہ اُن سے بہت آگے بڑھ گئے؛ یعنی انھوں نے ترکوں کے ایک سو گانووں سے زیادہ کو پورا پورا یا ادھورا، تو برباد کیا ہی تھا، انھوں نے سخت بے رحمی کے ساتھ سیکڑوں غیر مصافی ترکوں کا قتل عام کردیا؛ اور اپنے پیچھے جو اپنی نشانی چھوڑی وہ زمین پر مظلوموں کے خون کے دھبے تھے اور فضا میں آتش زدہ گانووں کا دھواں تھا؛ یونانی اپنے آپ کو "زمانہ حال کے جنگ صلیبی کے سپاہی" کہا کرتے تھے؛ یہ حالت تھی اُس مقدس فوج کی جس کو عیسائی انگلستان نے اس لیے مقرر کیا تھا کہ وہ اس کے حکم کو ترکوں سے منوا دے؛ یہ حالت تھی اُس مقدس فوج کی جس کے سامنے وہ جھنڈا اڑتا تھا جس پر مسیح (علیٰ نبینا و علیہ السلام) کی صلیب چمک رہی تھی؛ یہ تھی وہ مقدس فوج جس میں ہزاروں مقدس مقتدایان مذہب عیسوی ثواب حاصل کرنے کے لیے شامل تھے[1]۔

۲۶ راگست کو یونانیوں کی فوج کا خاتمہ ہوگیا۔ ایک ہی دن میں یونانیوں کا نام و نشان بھی مٹ گیا۔ حقیر و ذلیل قوم پرست بلا شرکت غیرے، غیر متنازع طور پر میدان کے مرد اور مالک رہ گئے! اس کے بعد ساحل کی طرف خوف زدہ "بقیۃ السیف" کی بھگدڑ اور سمرنا کی تباہی شروع ہوئی۔ شکست خوردہ ۔۔۔۔ کوٹے یونانی سپاہی اور غیر مصافی لوگ سخت دقت کے ساتھ ایشیا کے باہر نکال دیے گئے؛ قسطنطنیہ میں جو عثمانی گورنمنٹ کا نام و نشان رہ گیا تھا، وہ بھی ہوا ہو کر اڑ گیا؛ سلطان خلیفہ کو مجلس اعظم ملیہ نے اپنے حکم سے معزول کردیا اور وہ برطانیہ کے ایک جنگی جہاز میں بیٹھ کر اپنے پرانے دارالسلطنت سے رخصت ہوگئے؛ اُن کی جگہ ایک اور خلیفہ منتخب ہوئے، جن کو صرف دینی

[1] اگر زیادہ تفصیل دیکھنی ہو تو مسٹر کلیبر براؤنس اور مسٹر آرنلڈ ٹائن بی کے مضامین "ویسٹرن کویسچن ان گریس اینڈ ٹرکی" "کرنٹ ہسٹری" کے موقت الشیوع رسالہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

اختیارات حاصل تھے۔ سوا ایک تھوڑی سی برطانوی فوج کے، جو دردانیال پر پڑی ہوئی تھی، تمام ایشیاء کوچک، بحیرۂ اسود سے شام تک اور روس سے جزائر ایجی اَن تک، پھر ترکوں کے ہاتھ میں آگیا۔

برطانی گورنمنٹ کو ہرگز یہ امید نہ تھی کہ یونانی فوج کو شکست ہوگی اور وہ اس کو چاہتی بھی نہ تھی کیوں کہ اس کے معنی یہ تھے کہ اُس نے مغربی ایشیا پر قبضہ پانے کے بعد جو بڑے بڑے قلعے ہوا میں بنائے تھے وہ سب ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہوگئے۔ برطانیہ کی بحری اور بری ملکی فوج فوراً دردانیال کی طرف روانہ ہوگئی اور چناق میں اُس نے اپنی محفوظ چھاؤنی ڈال لی۔ لائڈ جارج کا دماغ بالکل خراب ہوگیا، اُس نے برطانیہ کے مقبوضات، یہاں تک کہ بلقان کی ریاستوں کی، خوشامد کی کہ ترکوں کو پس پا کردینے کے لیے کمکیں بھیجیں۔ امریکہ کے اخبار اور گرجاؤں کے منبروں پر سے دیوانہ پن ظاہر ہورہا تھا اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ کہہ رہے تھے کہ ترکوں کو یوروپ میں کبھی نہیں رہنے دینا چاہیے۔

لیکن یہ بات بہت جلد ظاہر ہوگئی کہ دنیا، جس میں حکومت برطانیہ بھی شامل ہے، جنگ سے بالکل تھک چکی ہے؛ جنگ کافی ہو چکی ہے۔ فرانس نے بجاء اس کے کہ انگلستان کی مدد کرتا بہت ہی جلد اپنی فوج دردانیال سے ہٹالی؛ اور اُس نے قوم پرست ترکوں سے اپنے دوستانہ تعلقات مضبوط کرلیے۔ اٹلی بڑا خوش ہوا کہ یونان مفلس اور بے عزت ہوگیا اور وہ اُس کی آیندہ کی خرابی کا منتظر ہو بیٹھا۔ جوگوسلاویا اور رومانیہ اپنے مصائب میں ایسے پھنسے ہوے تھے کہ اُن کو اپنے ہم سایہ کی طرف دیکھنے کی فرصت نہ تھی؛ وہ ماسکو کی دھمکی سے ڈرے ہوے اپنی فکر میں مبتلا رہے۔ چند ہفتوں کے بعد یونان اور برطانیہ عظمی کے لوگوں نے صاف صاف الفاظ میں اپنی یہ راء ظاہر کی کہ یہ جو کچھ ہوا ایک مجنونانہ فعل تھا؛ اور دونوں نے کانسٹین ٹن اور لائڈ جارج کی گورنمنٹوں کا خاتمہ کردیا۔ کانسٹین ٹن تخت سے اُتار دیا گیا اور وہ جلا وطنی ہی میں مرگیا۔ لائڈ جارج، جو فی الحقیقت اس مجنونانہ مہم کا اشتعال دینے والا تھا، خوش قسمت تھا کہ وہ ایک مہذب ملک کا باشندہ تھا، اس لیے جبراً سیاسی گم نامی میں پھینک دیا گیا۔ لیکن یونانی وزراء جو لائڈ جارج کے فریب میں آگئے ہوے تھے اور جنھوں نے برطانیہ کے وزیر اعظم کے وعدوں پر اعتبار کیا تھا کہ اُن کو برطانیہ کی مدد ملے گی، ایک سنگی دیوار اور جلادوں کی بندوقوں کی گولیوں کے درمیان مار ڈالے گئے۔ رہ گیا کریٹ کا رہنے والا وینی زیلوس، جس کی زبان زوری اور فصاحت و بلاغت اور ذاتی جادو کی سی کشش نے پیرس کی صلح کرانے والی جماعت کو ایسا مسحور کیا تھا کہ وہ اُس کی پالیسی کے حامی بن گئے تھے اور دوسروں کو نقصان پہنچا کر یونان کی حدود کو پھیلا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، اس نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیا کہ جو "خواب" "یونان عظیم" کا اُس نے دیکھا تھا اُس کی تعبیر غلط نکلی اور اتنی

بڑی یونانی سلطنت دُھواں بن کر ہوا میں غائب ہوگئی اور اُس کے ساتھ ہی اُس ملک کی تمام عظمت خاک میں مل گئی۔ اگر وہ کچھ کم لالچی ہوتا، اگر وہ اپنی جوع الارض کو روکے رکھتا، تو شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوتا کہ قوم پرست گروہ کو وہ عظمت و طاقت نہ حاصل ہوتی جو ہو گئی؛ اور آج بہ جائے ٹرکی کے یونان کے ہاتھ میں مشرق قریبہ کا توازن قوت ہوتا۔ صرف فصاحت و بلاغت اور ذاتی کشش ہی وہ چیزیں نہیں ہیں، جن سے آدمی سیاست داں بنتا ہے۔

نومبر ۱۹۲۲ء میں لوزان کے مقام پر ترکوں اور اتحادیوں کے درمیان گفت و شنید شروع ہوئی۔ یہ ۱۹۲۳ء کے جولائی تک برابر جاری رہی (درمیان میں ایک دفعہ وقفہ ہوا تھا) اور جب ختم ہوئی تو معاہدے پر دستخط ہی ہو کر ختم ہوئی۔ اس معاہدے کے مطابق ٹرکی کو پوری آزاد قوم تسلیم کر لیا گیا، کسی قسم کا اثر برائے نام بھی اُن پر نہیں رہا؛ نیز اُس کی حکومت کے حدود عراق عرب اور شام سے لیکر دریائے میرٹزا تک اور روسی ایرانی حدود سے لے کر بحر روم تک، بلا مداخلت غیرے تسلیم کر لیے گئے۔ لوزان کے عہد نامے پر دستخط ہونے کے یہ معنی ہیں کہ مشرق قریبہ میں ایک منصفانہ فیصلہ ہوا جس سے وہاں دوامی امن و امان ہو گیا۔

ان الارض للہ یورثہا من یشاء، تعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر
انک علیٰ کل شئی قدیر (مترجم)

قطعہ تاریخ وفات حضرت ریاض

(حضرت آسی دیوبری)

چلے ہیں حضرت خیام عصر دنیا سے
ہوئی ہے خدمتِ فنِ ادب میں عمر تمام
ہر ایک آپ سے کہتا تھا یہ دم تقریر
زبان سے ان کی نہ پہونچا کسی کو رنج کبھی
ادب سے لیتے ہیں نام ان کا آج اعدا بھی
بنے تھے قال سے اپنے تو رند بادہ پرست

تھے دُور آپ کی طینت سے نفس کے اغراض
رموزِ شعر و سخن سے بھری ہے اُنکی بیاض
زبان آپ کی یہ چل رہی ہے یا مقراض
خدا نے ان کی طبیعت میں بھر دیا اِغماض
کسی نے آج تک اُن سے نہیں کیا اِعراض
مگر جو حال کو دیکھا تو تھے فضیل عیاض

نشاں میں نے جو پوچھا کہا آسی نے
کہ اِن پہ فاتحہ پڑھیے۔یہی ہے قبر ریاض

۱۳ ھ ۵۳

ایک المناک رومان

(جناب مولوی صادق الخیری صاحب بی اے دہلوی)

شام ہو چکی تھی۔—

پادری فلبرٹ مسکراتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اسکے چہرے پر اپنی بھتیجی ہیلی زی کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کسی اندرونی مسرت کے آثار نمایاں ہوئے قدرت نے ہیلی کو پرورش کے لیئے اسکے سپرد کر دیا تھا اور کلیسائے نوٹرڈیم کے پادری ہونے کی حیثیت سے اس کو ایسے ذرایع میسر آگئے تھے جن کی وجہ سے اس نے ہیلی کو عمدہ تعلیم دلائی تھی۔ اور یہ تعجب انگیز تھا، کیونکہ گیارہویں صدی میں علم صرف مردوں تک محدود تھا، اور ان میں بھی صرف خواص کے لیے۔ ابتدائی تعلیم اس نے اپنی ان تھک کوششوں سے ارگنلائل میں حاصل کی تھی اور یہاں اپنے چچا کے زیر نگرانی اس کے بڑھتے ہوئے شوق نے معلومات کے دائرے کو نہایت ہی وسیع کر دیا۔

بھتیجی کے اصرار پر فلبرٹ سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور اُس نے بڑے فخر سے ہیلی کو یہ خوشخبری سنائی کہ اسکی مزید تعلیم کے لیے وہ ایبے لارڈ جیسی شخصیت کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ایبے لارڈ! فرانس کا سب سے بڑا معلم! فلسفے میں یکتا! دینیات میں فرد! جسکے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ چکی تھی!!

فلبرٹ کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی کہ اُس کے دوست ایبے لارڈ نے اس کی تجویز منظور کر لی ہے اور وہ عنقریب آکر اس کا مہمان رہے گا اور اپنا کچھ وقت ہیلی کی تربیت پر صرف کرے گا۔

ہیلی نے اُس کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں اور جب وہ دونوں تنہائی میں ملے تو ایک ایسے زبردست رومان کا آغاز ہوا جس کی موسیقی میلوں دُور بجنے والے گھنگھروں کی طرح اب بھی شیریں ہو کر ہمارے کانوں میں گونجتی ہے۔ ہیلی اٹھارہ سالہ دوشیزہ تحیرِ حُسن کا مجسمہ تھی ایک ایسا غنچہ ناشگفتہ جس کی دلفریبی نے ایبے کو دل گرفتہ کر لیا تھا۔ ایبے کی عمر اس وقت اڑتیس ۳۸ سال کی ہوگی۔ وہ دونوں ایسی عمروں سے گزر رہے تھے جبکہ ایک تنہا ملاقات جذبات آتش فشاں تخلیق کر دیتی ہے۔ دماغی قابلیت کے علاوہ جسمانی خوبصورتی نے ایبے کو مسحور کر لیا اور اسی طرح سہری آواز میں بولے ہوئے ایبے کے جادو بھرے الفاظ سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔

تعلیم؟ سوائے محبت کی طویل باتوں کے

اسباق ہی کیا ہو سکتے تھے۔ گھنٹوں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ایسی ہی باتوں میں اپنا وقت گزارنے لگے۔ پھر بھی ہیلی کی تعلیم ارگنٹائل کی خانقاہ میں ہوئی تھی جہاں عورت کا ایمان یہ تھا کہ وہ خواہشات سے احتراز کرے اور نفس پر قابو حاصل کرے گر .... دنیا کے تمام قوانین، مذہب کے سارے احکام، گرجا کے کل اصول، بعد الموت آتشیں لپٹوں کی ہولناک سختیاں ——— ان سب کی کیا حقیقت ہے جبکہ ایک عورت کا ہاتھ ایک مرد کے ہاتھ میں تھرتھرا جائے؟ اور اس طرح ایبے نے حسین و جمیل ہیلی کو، جس میں مزاحمت و مخالفت کی کوئی طاقت یا خواہش نہ تھی، اپنے قوی بازوؤں کی آغوش میں لیکر الفت کے راگ الاپنے شروع کردیے۔ وہ دونوں دنیا کو بھول گئے اور صرف محبت کرنا انکی زندگی کا مقصد رہنے لگا۔

(۲)

ایبے نے اپنے جسم اور روح کو محبت میں ایسا منہمک کیا کہ اُسے شاگردوں اور لکچروں کا بھی خیال نہ رہا۔ فلسفہ، منطق، فقہ، الٰہیات، لسانیات، جنھوں نے اُسے وحید العصر بنا دیا تھا اب اس کے لیے کچھ وقعت ہی نہیں رکھتے تھے۔ اس کا بیشتر وقت محبت کی نغمہ سرائی میں گزرتا تھا ——— افسوس یہ نغمے اب ہم سے ہمیشہ کے لیے چھین لئے ہیں۔

تھوڑے ہی عرصے میں دنیا ان کے عشق سے واقف ہوگئی ——— لیکن بوڑھے پادری کو علم نہیں ہوا، اُس نے کبھی نہیں دیکھا، خیال تک نہ کیا، حالانکہ وہی سب سے قریب تر تھا، گر اُس کو سب سے آخر میں خبر ہوئی۔ وہ غضبناک ہوگیا، اُسکے ماتھے کی نیلی رگیں اُبھر آئیں اور وہ طیش میں چلا کر بولا "میرے ساتھ یہ فریب؟ مکار نے مجھے ل کر دغا دی۔ میں اس محبت کا (آہ! یہ تو انسانی قیاس اور خیالی گھمنڈ ہے) خاتمہ کرکے رہوں گا!" اس کا سخت دل، جو مقدس اور مذہبی فضاؤں میں پتھر ہو چکا تھا، اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے ہر فعل پر مستعد تھا اور اس لیے ایبے لارڈ لسانیات کا ماہر، مباحثے میں لاثانی، الفاظ کا جادوگر، اُس خشمناک پادری کے آگے بے بس ہوگیا اور اسی طرح ہیلی کے غمناک آنسو بھی فلبرٹ پر کوئی اثر نہ کر سکے۔

——— محب و محبوب جدا کردیے گئے!

فلبرٹ، بوڑھی دنیا کی طرح جو اپنے عالم شباب کو محو کر چکی ہے، ان کی اس جدائی سے مطمئن ہوگیا۔ بھلا وہ کیسے جان سکتا تھا کہ عام نظر میں وہ دونوں صرف اس لیے ایک دوسرے لاپروا رہتے ہیں کہ تنہائی میں چھپ چھپ کر انکی ملاقاتیں ہو جاتی ہیں۔ جذبہ کلی ہے اور محبت پھول لیکن پھل؟ ——— یہ "زندگی" ہے اور ایک دن خوفزدہ پرندے کی طرح ہیلی نے ایبے سے یہ بات کہدی۔ اِدھر چچا کی خشمناک آنکھیں اسکے لیے

ناقابلِ برداشت تھیں۔ وہ سوچنے لگتی کہ چچا میرے شکم کو گھور رہا ہے، لیکن فلبرٹ کو اس کا گمان بھی نہ تھا، پھر بھی اس کا مخفی خوف کسی طرح کم نہ ہوتا۔

فرار ہی ان کا آسرا رہ گیا تھا، چنانچہ ایک رات کو جبکہ پادری کہیں گیا ہوا تھا وہ دونوں برٹینی روانہ ہو گئے اور جب تک اسے پیرس کی سڑکیں نظر آتی رہیں وہ چوروں کی طرح پردے ڈالے گاڑی میں دبکے رہے۔ برٹینی ایبے لارڈ کا آبائی وطن تھا اور اس کی بہن نے ہیلی زی کا نہایت محبت سے استقبال کیا۔ یہیں ہیلی کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اسطرلاب رکھا گیا۔ فلبرٹ عزت پر جان دیتا تھا اور اس کی رائے میں اسے حاصل کرنے کے لیے انسانی قربانی بھی جائز تھی اُن دونوں نے رازدارانہ شادی کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن فلبرٹ کو اس سے کوئی اطمینان نہ ہوا۔

اس وقت ہیلی نے دنیا پر ظاہر کر دیا کہ اس کی فطرت نہایت بلند اور تقدس مآب ہے۔ بجائے اس کوشش کے کہ وہ شادی شدہ عورت کا مرتبہ حاصل کرے، اُس نے شادی کی خواہش ہی نہیں کی۔ اس قدر وسیع آدمی کی بیوی ہونا بڑا فخر تھا لیکن اُس کا دل اس سے بھی کسی بلند خیال کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کے پیشِ نظر اس کی زبردست شخصیت، اسکا ہنگامہ پرور وجود، اس کی محبوب ہستی، اس کی تمام عمر آزادی شہرت، اور عزت تھی ——— وہ ان کو داغ لگانا نہیں چاہتی تھی۔ ایک دن جبکہ خیالات کا بے پناہ سیلاب اُس کے دماغ میں گردش کر رہا تھا وہ سوچنے لگی "اگر خدانخواستہ شادی ہو گئی تو مذہب کو کس قدر نقصان پہونچے گا! فلسفہ نامکمل ہی رہ جائے گا! اور یہ کس قدر شرمناک امر ہے کہ وہ شخص جو تمام دنیا کے لیے پیدا ہوا ہے صرف ایک عورت کا غلام بن جائے؟..... کیا کوئی ایسا شخص ہے جو تفکر و فلسفے کی تعمیر یا کتب مقدسہ کے مطالعے کے لیے مخصوص ہوتے ہوئے بچے کے رونے، انّا کی لوری، نوکروں کے آنے جانے اور اولاد کی بڑھتی ہوئی پریشانیوں کو برداشت کرے؟"

اس کا بے غرض انہماک ان چند فقروں سے ظاہر ہوتا ہے، جو اس نے ایبے کے نام اولیں خط میں لکھے:۔

"میں نے اپنی خواہشات کا ..... کبھی خیال بھی نہیں کیا،

یہ صرف تمہاری ہی خواہشات تھیں، تم اچھی طرح جانتے ہو، جن کی تکمیل کو میں نے اپنا فرض سمجھا۔

اگرچہ "شریکِ حیات" کہلانا زیادہ مقدس اور اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن میں ایک خادمہ بلکہ لونڈی ہی کہلانے کو ترجیح دیتی ہوں ......

کیونکہ میرا خیال ہے کہ جتنا میں اپنے آپ کو تمہاری خاطر دوسروں کی نظروں میں گرا دوں گی اتنا ہی کم دھبہ میری وجہ سے تمہاری شہرت اور بڑھتی ہوئی عزت پر لگے گا۔"

باوجود اس قدر بلند خیالات اور پاک ثبوت کے جو اس نے اپنی محبت کا دیا، فلبرٹ نے ہیلی سے اصرار کیا کہ وہ رازدارانہ شادی ہی پر رضامند ہو جائے کیونکہ اس طرح کم ازکم وہ اپنے بچے اسطرو کو بدنامی سے بچا سکیں گے

وہ پیرس واپس آ گئے اور تھوڑے دنوں بعد فلبرٹ اور اُس کے چند دوستوں کی موجودگی میں ایبے لارڈ اور ہیلی زی کی شادی ہو گئی۔

(۳)

جوں جوں وقت گزرتا گیا بوڑھے پادری کی دشمنی حق بجانب ثابت ہوتی گئی، کیونکہ تو قع کے خلاف ایبے پر غرور پوری طرح مسلط ہو گیا اور گھمنڈ میں آ کر وہ اتنا اندھا ہوا کہ اپنے آپ کو بالکل آزاد اور قادر سمجھنے لگا۔ ایک موقع پر خیال خام میں سرشار ہو کر وہ کہنے لگا "میری شہرت کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا اور میں اس قدر جوان اور خوبصورت ہوں کہ جس عورت سے چاہے محبت کروں اور چاہے جس سے شادی۔ مجھے کسی کا خوف نہیں۔ فلبرٹ نے اپنی بھتیجی کو میرے حوالے کر دیا اور مجھ سے توقع تھی کہ میں اپنا خالی وقت اس کی تعلیم پر صرف کروں

اُلفوا وہ محبت کے انسانے پڑھنے لگی اور پھر..... خوب ہوا"۔ غرض اس قسم کی فضول باتیں ایک اخلاقیات کے اُستاد کے قلم سے نکلنے پر تعجب ہوتا ہے۔

فلبرٹ سخت تکلیف اور پریشانی کے عالم میں تھا۔ اُسے ہیلی سے بڑی محبت تھی؛ بچپن سے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ اور جب وہ تعلیم یافتہ ہو کر جوان ہو گئی تھی، اُسے پوری مسرت نصیب ہوئی کہ جو کام قدرت نے اس کے سپرد کیا تھا وہ پورا ہو گیا۔ اس نے اس کی پرورش و تعلیم پر اپنی زندگی صرف کر دی اور جب پھل پک کر تیار ہو گیا تو ایک اجنبی آگے بڑھا کہ اُسے توڑ لے۔ یہ بھی برداشت ہو سکتا تھا لیکن اجنبی سنگدل تھا۔ ہیلی ایبے پر قربان ہونے کے لیے تیار رہتی، لیکن وہ اپنے غرور پر پھولا ہوا تھا اور اس چیز نے فلبرٹ کی نگاہ میں اُسے رہزن بنا دیا مگر ایبے کے لیے ہیلی پھر بھی ڈھال تھی اور اس لیے اُسے نقصان پہنچانا مشکل تھا۔ جب فلبرٹ کو یہ علم ہو گیا کہ اُس کی بھتیجی ایبے کی ہر کمظرفی اور خود غرضی خواہش کی تکمیل اپنا ایمان سمجھتی ہے تو اس کا قلب سراسر نفرت و حقارت کا مرکز بن گیا اور اس کی روح کی بالیدگی تنفر و تحقیر کے خونیں پھول کھلانے لگی۔

ایبے نے فلبرٹ سے وعدہ لے لیا تھا کہ شادی کی تشہیر نہ ہو گی۔ کچھ عرصے تک اُس نے ایفاء وعدہ کی کوشش کی مگر ایبے کی بدعنوانیاں اب ناقابل برداشت ہو گئی تھیں۔ چنانچہ لوگوں کو ایبے اور ہیلی کے رشتۂ ازدواج کا علم ہو گیا۔

آبے اس پر غضبناک ہو گیا لیکن ہیلی نے اُسے اطمینان دلایا - اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ معصوم ہیلی اُسے خوش کرنے کے لیے ہر مصیبت کا سامنا کرلیگی تو اُس نے شادی ہی سے انکار کر دیا - اس سے فلبرٹ کو نہایت رنج ہوا اور یہ سن کر اُس کے غم کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس کی عزیز بھتیجی نے زندگی کی مقدس ترین قسم کھالی ہے کہ وہ آبے لارڈ کی بیوی نہیں بلکہ خادمہ ہے -

فلبرٹ نے ہیلی کی (وہ ہیلی جو جھوٹ بولنے کی ہمت اور قابلیت سے قاصر تھی) آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دفعہ اور پوچھا "کیا تیری شادی نہیں ہوئی؟" اُس نے صاف کہدیا "نہیں"! فلبرٹ غضبناک ہو گیا —— قہر آلود خشمناک!!

(۴)

بُت پرس، محبت اعظم، وحید العصر آبے نے ستم ہی کر دیا - جن دنوں فلبرٹ غصہ و غم کی کشاکش میں مبتلا تھا - آبے نے ہیلی کو ترغیب دی کہ وہ ارگنطائل چلی جائے جہاں اُس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے، تاکہ پریشانیِ دماغ کو سکون حاصل ہو، لیکن وہاں پہونچ کر خلاف توقع ہیلی کو تلخ او مایوس کن تجربہ ہوا —— ابے لارڈ اسے خانقاہ میں رہنے اور راہبہ بننے پر مجبور کر رہا تھا! ہیلی نے اپنے بچے کو آبے کی بہن کے سپرد کرتے وقت ہی دل میں ایک دُگدا سا محسوس کیا تھا اور اب وہی ہو کر رہا جس کا اُسے ڈر تھا - جب فلبرٹ کو علم ہوا کہ وہ خانقاہ بھیجدی گئی ہے تو اُس کے غصے اور صدمے کی انتہا نہ رہی اور اُسے یقین ہو گیا کہ آبے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے -

"تو وہ اس کو راہبہ بنا دے گا ..... خانقاہ میں رہنے والی ..... ایک راہبہ!" یہ خیال تھا جس نے اُسے ایک شیطانی اور کریہ ارادے پر آمادہ کرلیا اور وہ یہ کہ "میں اُسے راہب بنا کر چھوڑونگا" اور اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے اُس نے دو بدمعاشوں کو ابے کے پیچھے لگا دیا، جنھوں نے آبے کے ملازم کو روپیہ دے کر اپنی سازش میں شریک کر لیا اور اسکی مدد سے کمرے میں گھس کر رات کے وقت اُسکے جسم کو بُری طرح زخمی اور صورت کو مسخ کر دیا اور اس طرح آبے جسمانی طور پر بالکل ناکارہ ہو گیا - جوان و خوبصورت مرد کی جوانی مرجھا گئی اور وحید العصر کا غرور خاک میں مل گیا .... تھوڑے ہی عرصے بعد وہ بھی سینٹ ڈنیس کی خانقاہ میں شریک ہو گیا - ہیلی نزی راہبہ بن گئی —— ابے لارڈ راہب بن گیا!!

ان دونوں کی خط وکتابت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیلی نزی ہمیشہ آبے کی محب اور وفادار رہی اور خانقاہ ارگنطائل کی راہبہ ہونے کے باوجود اسکے محبت میں کوئی فرق نہیں آیا - غمناک الفت نے اسکے دل و دماغ پر اپنا جال بچھا دیا تھا اور اسکے رابطہ روح کے مجروح تار ہمیشہ محبت کی موسیقی [illegible]

کانپتے رہے۔ اسکے ایک خط میں سے چند فقرے نقل کیے جاتے ہیں جو اُسکے جذبات کے صحیح ترجمان ہیں

"تم معبد میں شریک ہوے اور میں بھی —— بلکہ میں نے ہی پہل کی۔ لیکن تم نے پہلے مجھے راہبہ بننے پر مجبور کیا —— اس قدر بدگمانی؟ تمھاری قسم، مجھے اس سے دلی صدمہ ہوا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اُس سے زیادہ مجھے تمھاری پروا رہی اور اُس سے زیادہ تمھیں خوش رکھنے کا مجھے ارمان رہا۔ تم نے صرف کہا ہی تھا کوئی خدائی احکام تو تھے ہی نہیں اور میں نے راہبہ بننا فوراً قبول کرلیا۔ مجھے صرف یہ بتادو کہ تم مجھے اتنی جلد کیوں بھول گئے۔"

۱۱۲۷ء میں حکومت نے خانقاہ ارگنٹائل پر قبضہ کرلیا۔ چنانچہ تمام گوشہ نشیں زاہد خواتین وہاں سے چلی گئیں اور دو سال تک ادھر اُدھر ماری ماری پھرتی رہیں۔ اس مصیبت کو دیکھکر ابے لارڈ نے اپنی نئی عمارت اُن کی سکونت کے لیے پیش کی اور روحانی تلقین و تبلیغ کی غرض سے وہ خود وہاں آنے جانے لگا۔

ایک دفعہ ابے نے خواہش ظاہر کی کہ اُسے اسی عمارت میں دفن کیا جائے۔ ہیلی جواب میں بولی "... لیکن تمھیں دفن کرنے سے پیشتر میں تمھاری قبر میں اپنی لاش تہ خاک کرنے کی زیادہ آرزومند ہوں۔"

سولہ سال بعد ابے کی خواہش پوری ہوگئی۔ یہ اپریل کا مہینا تھا۔ ہیلی نے اُس کی قبر پر پھولوں کی تمام دولت نچھاور کردی۔ وہ خود بھی زیادہ زندہ نہ رہ سکی اور تھوڑے ہی عرصے بعد ہیلی کی لاش دفن کرنے کے لیے مقبرہ پھر کھولا گیا۔

مئی کے مہینے میں جبکہ گلاب کے پھول اپنی فراوانی اور تعطر کی وجہ سے مرکز نگاہ بنے ہوتے ہیں اس عمارت میں جہاں ابے اور ہیلی کی لاشیں دفن تھیں پاک محبت کی شادی رچائی گئی اور تمام مقبرہ قرمزی پھولوں کا تختہ بن گیا۔ جسمانی طور پر بھی انکی شادی ناقابل تنسیخ ہوگئی اور اب گرجے کا کوئی قانون بھی انکو جدا نہیں کرسکتا۔ انکا مقبرہ غیر فانی محبت کا حجلۂ عروسی ہے۔ (ترجمہ)

مرقومات رقم

چاندنی رات ہے اے رشکِ قمر ہوش میں آ — چاند ہالے میں ہے تو بھی مرے آغوش میں آ
ٹپکی پڑتی ہے گری پڑتی ہے میخواروں پر — سنبھل او بنتِ عنب ہوش میں آ ہوش میں آ
کشتِ اُمید مری خشک ہوئی جاتی ہے — ہاں یہی وقت ہے اے ابرِ کرم جوش میں آ
کوکبِ بختِ رقم تو ہے عبث گردش میں — کاش آویزہ بن اور اُنکی بناگوش میں آ

امیر علی رقم لکھنوی

دربارِ رامپور کے چار شاعر

(جناب مولوی محمد اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل)

ڈاکٹر ٹی گراہم بیلی ایم اے۔ بی ڈی۔ ڈی لٹ لندن یونیورسٹی میں شعبۂ اردو و ہندی کے ریڈر ہیں۔ آپ نے انگریزی زبان میں اردو ادب کی تاریخ پر ایک مختصر کتاب "اے ہسٹری آف اردو لٹریچر" تصنیف کی ہے جس میں ۲۴۰ ارباب قلم کے حالات اور انکی تصانیف پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان تمام تصنیفات سے استفادہ کیا گیا ہے جو ۱۹۳۲ء سے قبل ادبیات اردو کے موضوع پر شائع ہو چکی تھیں اور ایک مختصر پیمانہ پر ضروری معلومات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ سطور ذیل میں اسکے ایک حصہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ شاید قارئین کرام اپنی مادری زبان کے چار سربرآوردہ کے متعلق ایک یوروپین محقق کے اظہار خیال کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اظہار

امیر و داغ

امیر احمد مینائی (۱۸۲۸ء-۱۹۰۰ء) اور نواب مرزا خاں داغ (۱۸۳۱-۱۹۰۵ء) میں ہم کو دو ہمعصر مقابل شعرا کی ایک اور مثال ملتی ہے۔ سودا اور میر کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ بڑی حد تک امیر و داغ پر بھی صادق آتا ہے۔ غدر کے بعد جب دربار لکھنؤ اجڑ گیا تو تسلیم اور جلال کے ساتھ دربار رامپور کی زینت بنے۔ امیر اپنی استعداد علمی کی وجہ سے شوکتِ الفاظ پر قادر تھے۔ داغ فطری شاعر تھے۔ ان کی زبان نسبتہً زیادہ رواں، سلیس، اور بامحاورہ ہے۔ سودا کی طرح امیر کا درجہ قصیدہ میں بلند ہے۔ جسکے لیے پرشکوہ انداز بیان لازمی ہے۔ داغ میر کے مانند عاشقانہ غزلوں میں فوق رکھتے ہیں جن کے لیے سوز و گداز اور سادگی زیادہ مناسب ہے۔ بدقسمتی سے دونوں بالخصوص داغ نے مبتذل اور رکیک مضامین سے اپنے دامان شاعری کو آلودہ کیا۔ امیر کے علم و فضل کا ثبوت انکی امیر اللغات ہے جسکا آغاز عظیم الشان پیمانہ پر کیا گیا تھا، لیکن ابھی دو ہی حصے چھپنے پائے تھے اور حرفِ اول (الف) بھی نامکمل تھا کہ لغت ختم ہوگئی۔ مذہبی موضوعات خصوصاً حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے میلاد، حیات، وفات اور سیرت پر آپ نے اکثر نظمیں لکھیں لیکن ان میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ان میں صحیح شاعرانہ جوش مفقود ہے اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے نزدیک وہ محض رسمی ہیں ان میں گرمی نہیں۔ انکی غزلوں کا پہلا مجموعہ ۱۸۵۷ء کی شورش میں برباد

ہوگیا اس لیے ان کے دوسرے دیوان مرآۃ الغیب ہی کو عام طور پر پہلا دیوان سمجھا جاتا ہے۔ اسکی تکمیل کے بعد اُن کو خیال ہوا کہ اس رنگ کی شاعری کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ انکے دوست اور حریف داغ کو انکی بہ نسبت زیادہ قبول عام حاصل ہے۔ اُنھوں نے اپنا طرز بدل لینے کا عزم کر لیا۔ اس عمر میں یہ چیز بہت دشوار تھی لیکن انکے متعلق مشہور تھا کہ بڑھاپے کے ساتھ انکی طبیعت جوان ہوتی جاتی تھی۔ داغ کی تقلید میں اُنھوں نے سادگی اختیار کی اور روزمرہ لکھنا شروع کیا۔ بعض نقاد انکے دوسرے دیوان صنم خانۂ عشق کو پہلے دیوان پر ترجیح دیتے ہیں لیکن اس پر عام اتفاق ہے کہ وہ داغ کا جواب نہ بن سکے۔ اور یہ امر تعجب خیز بھی نہیں۔ داغ مختصر غزلوں کے اُستاد تھے۔ آپ کا تیسرا دیوان "محامد خاتم النبیین" کے لیے وقف ہے (شاعری کی یہ صنف نعت کہلاتی ہے) ان کے گراں بہا مکاتیب کے مجموعہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جن کے شایع کرنے کا خیال غالباً رقعات غالب کی اشاعت سے پیدا ہوا۔ انکے تذکرہ "انتخاب یادگار" (سنہ ۱۸۷۳ء) میں رامپور کے شعرا کے حالات و سوانح درج ہیں۔ یہاں برسوں رہنے کے بعد وہ عازم حیدرآباد ہوئے اور وہاں پہونچنے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انتقال کر گئے۔

داغ کا مرتبہ اُنکے ہموطن ارباب ادب کی نگاہ میں بہت بلند ہے۔ بہتوں کے نزدیک تو وہ اُردو کے بہترین بارہ شاعروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ وہ سلیس اور خوبصورت زبان نہایت روانی سے لکھتے ہیں اور صحیح محاورات کے تو گویا دریا ہیں لیکن جذبات کی گہرائیوں تک نہیں پہونچتے۔ بیسویں صدی تک بھی بقید حیات رہنے کے باوجود وہ عہد قدیم کے شاعر تھے۔ وہ ذوق کے شاگرد تھے۔ جن کا رجحان طبع دہلوی ہوتے ہوئے بھی لکھنؤ کے رنگ کی جانب تھا۔ داغ کی شاعری کے دو دور ہیں۔ عہد رامپور اور عہد حیدرآباد۔ جب تک وہ رامپور میں رہے گردش پیہم کے شعرا کی تنقید میں اُنھیں محنت سے شعر کہنے کی طرف مائل کرتی رہتی تھیں۔ اُنکی شاعری کا بہترین سرمایہ گلزار داغ، آفتاب داغ، اور فریاد داغ یہیں عالم وجود میں آیا۔ حیدرآباد پہونچنے کے بعد اُنھوں نے مہتاب داغ، یادگار داغ، اور اُس کا ضمیمہ مرتب کیا۔ یہاں وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ہر طرف قدردان ہی قدردان تھے۔ نکتہ چیں کوئی نہ تھا۔ اس لیے وہ کسی قدر بے پروا ہو گئے۔ اس سے انکی شاعری کو نقصان پہونچا۔ اُن کا شمار بہترین غزل گو شعرا میں ہے لیکن انکے متعلق رطب اللسان ہونا آسان نہیں۔

تسلیم ۱۸۱۹ء-۱۹۱۱ء | آپ کا اصلی نام احمد حسین تھا۔ لیکن امیر اللہ کے نام سے مشہور تھے۔ نواح فیض آباد

میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپ کا خاندان لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ جہاں تلاشِ معاش میں آپ نے اپنی عمر کا کثیر حصہ گزارا۔ تنگدستی نے کبھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آپ لازماً قدیم خیال کے طبقہ سے متعلق تھے۔ آجکل آپ کی شاعری کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا۔ آپ کی تصنیفات میں آٹھ مثنویاں (جن میں نالۂ تسلیم، صبح خنداں اور دل و جان زیادہ مقبول ہیں) سفرنامۂ نواب رامپور (اس میں نواب رامپور کے سفر کی طویل روداد تقریباً پچاس ہزار اشعار میں منظوم کی ہے غیر مطبوعہ ہے) اور پانچ دیوان تھے جن میں سے ایک ہنوز طبع نہیں ہوا۔ ایک ایامِ غدر میں جاتا رہا۔ بقیہ نظمِ ارجمند، نظمِ دلافروز اور دفترِ خیال کے نام سے چھپ گئے ہیں۔

نظم دلفروز میں تقریباً دو ہزار اشعار قصائد کے گیارہ ہزار غزل کے اور تیرہ سو دیگر اصنافِ سخن کے ہیں۔ دفترِ خیال کا حجم اس سے نصف ہوگا اس میں صرف مختصر غزلیں ہیں۔ نظمِ ارجمند آپ کی غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ آپ کے قصیدہ کا انداز بھی ایسا ہے جو غزلوں کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ شعرائے رامپور میں آپ بہترین مثنوی گو شاعر تھے۔ آپ کی زبان میں سلاست اور متانت اور تخئیل میں قوت تھی۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے جن میں سے سرزا اور دو مشہور شعراء حسرت موہانی ہیں۔

ضامن علی جلال
۱۸۳۴ء–۱۹۰۵ء

دربارِ رامپور میں عروض و قواعد دانی کے لیے مشہور تھے۔ چار دیوانوں کے علاوہ جن میں قصائد اور غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد تقریباً بیس ہزار ہے۔ زبان پر آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ ان میں سے بعض کم و بیش نسخے کے مختصر رسالے ہیں۔ مفید الشعراء تذکیر و تانیث پر ایک رسالہ ہے۔ سرمایۂ زبانِ اردو محاورات کا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ قواعد المنتخب میں تغیرِ الفاظ پر بحث کی گئی ہے۔ انکے علاوہ آپ نے دو اردو لغات بھی تالیف کیں۔

یہ سمجھنا دشوار ہے کہ تسلیم اور جلال جیسے اشخاص کی شہرت کا انحصار کس چیز پر ہے۔ ان کے قصائد اور غزلیں رسمی ہیں۔ ان کے کلام کی خوبی جذبات کی گہرائی سے طرزِ ادا کی شوخی میں ہے۔ غزلوں میں وہی سنگدل ہلاکت پسند معشوق کی شکایتیں اور دل جلے عاشق کے مصائب کی داستانیں ہیں۔ اور انکے قصائد میں نازیبا تعریفیں۔ انکے لیے اردو شاعری کا عصرِ جدید ابھی شروع نہ ہوا تھا۔

خالدہ ادیب خانم نے شرق و مغرب کی کشمکش پر جو آٹھ خطبے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں دیے تھے انکا یہ اردو ترجمہ شایع ہوا ہے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت عمار　　**مینیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**

جگت موہن لال رواں

(جناب مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی ملقب بہ لسان القوم)

عاشقِ اردو جگت موہن رواں — نکتہ فہم و نکتہ سنج و نکتہ داں
بے تعصب پاک باطن خوش تمیز — وسعتِ اخلاق سے ہر دلعزیز
شاعرِ خوشگو وکیل کامیاب — لایق و فایق کمالات انتساب
بے ریا مخلص شریف النفس نیک — درحقیقت آدمی لاکھوں میں ایک
کیا قیامت ہے وہی سرو رواں — اس طرح ہو جائے بے نام و نشاں
پانوں ٹوٹیں مرگِ بے ہنگام کے — دکھ دیا جس نے عوض آرام کے
گُل کیا روشن چراغ اناؤ کا — ہو گیا تاراج باغ اناؤ کا
سروِ دلجو کی جوانی کا تھا وقت — یا یہ مرگِ ناگہانی کا تھا وقت
کیسے کیسے اُٹھ گئے یارانِ فن — اب ہے اک ماتم کدہ یہ انجمن
اعتبارِ زندگانی کچھ نہیں — بے طلسم اک دارِ فانی کچھ نہیں
ہو چکی تھی گُل ابھی اک شمع بزم — ہونے پائی تھی نہ خاطر جمع بزم
دوسری شمع ادب گُل ہو گئی — تیرہ دنیائے تخیل ہو گئی
اک سرائے ہے یہ جہانِ بے ثبات — چند روزہ رہنے والوں کی حیات
قافلے کے قافلے پہنچے عدم — آہ اُن کا رنج و غم ہے اور ہم

تا کجا آخر صفیؔ غم کیجیے
آئے دن کس کس کا ماتم کیجیے

مجذوبؒ کی بڑ

(جناب خواجہ سید عزیز الحسن غوری صاحب مجذوب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس)

ان کو تو نے کیا سے کیا شوقِ فراواں کر دیا
پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں کر دیا

فکرِ این و آں نے جب مجھکو پریشاں کر دیا
میں نے سر نذرِ جنونِ فتنہ ساماں کر دیا

دل قفس میں لگ چلا تھا پھر پریشاں کر دیا
ہمصفیرو تم نے کیوں ذکرِ گلستاں کر دیا

دردِ دل نے اور سب دردوں کا درماں کر دیا
عشق کی مشکل نے ہر مشکل کو آساں کر دیا

طبعِ رنگیں نے مری گل کو گلستاں کر دیا
کچھ سے کچھ حُسنِ نظر نے حسنِ خوباں کر دیا

زاہدوں کو بھی شریکِ بزمِ رنداں کر دیا
سینکڑوں کو دخترِ رز نے مسلماں کر دیا

جب فلک نے مجھ کو محرومِ گلستاں کر دیا
اشکہائے خوں نے مجھکو گل بداماں کر دیا

جاں سپردِ تیر اور خوں صرفِ پیکاں کر دیا
پاس جو کچھ تھا مرے سب نذرِ مہماں کر دیا

"ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم"
کر کے جرأت ان سے آج اظہارِ ارماں کر دیا

پھونک دی اک روح تو مجھ میں مری ہر آہ نے
دردِ دل نے میری رگ رگ کو رگِ جاں کر دیا

میرے چارہ گر کا دیکھے تو کوئی حُسنِ علاج
محوِ دل سے امتیازِ درد و درماں کر دیا

جوشِ وحشت کی مرے دیکھو عجائب کاریاں
دشت کو ذرہ تو ذرے کو بیاباں کر دیا

زلف و رخ کو ڈھانکیے یہ بھی کوئی انداز ہے
اس کو حیراں کر دیا اُس کو پریشاں کر دیا

تو نظر آنے لگا، کی اس قدر گہری نظر
میں نے جس ذرے کو دیکھا ماہِ کنعاں کر دیا

تلخ کر دی زندگی شورش تری کچھ حد بھی ہے
اف مرے ہر زخم کو تو نے نمکداں کر دیا

جنکی استادی پہ خود حکمت بجا کرتی تھی ناز
ایک امی نے انہیں طفلِ دبستاں کر دیا

میں ہوں رندِ پاک باطن دامنِ تر کو نہ دیکھ
دخترِ رز کو بھی میں نے پاک داماں کر دیا

یہ تری زلفیں، یہ آنکھیں، یہ ترا مکھڑا، یہ رنگ،
حور کو اللہ کی قدرت نے انساں کر دیا

چپکے چپکے، اندر اندر، تو نے اے شوقِ نہاں
دل کو میرے رازدارِ حسنِ پنہاں کر دیا

ٹوٹ جاتے کیوں نہ ٹانکے زخم کے دیکھا غضب
شاملِ بخیہ مرا تارِ گریباں کر دیا

مجھکو سوجھا بھی تو کیا مجذوب وحشت کا علاج
میں نے دل وابستۂ زلفِ پریشاں کر دیا

نظرے خوش گزرے

ماہ گزشتہ میں بھی باوجود تاکیدی ہدایات کے پرچہ وقت پر تیار نہ ہو سکا خانگی علالت کے سبب جو انتظام اکتوبر میں نہیں بن پڑا ممکن ہے کہ اس دفعہ کامیاب ہو جائے اسی امید میں حجم گھٹانے کا خیال ترک کر دیا گیا لیکن اگر خدانخواستہ یہ پرچہ بھی ناوقت شائع ہوا تو دسمبر میں اسی نسخے پر عمل کرنا ہوگا۔

حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی کا شہرہ تو سارے ملک میں ہے مگر ہمیں اس کی زیارت اب نصیب ہوئی۔ یونیورسٹی پہلے بیرون بلدہ کے سرکاری محکمہ جات سے قریب تھی مگر اب شہر سے بہت فاصلہ پر ہے اس سبب سے ابھی تک اس کا موقع نہیں ملا کہ یونیورسٹی کی آبادی میں رہ کر وہاں کی زندگی اور کام دونوں کا مطالعہ کیا جاتا مگر یونیورسٹی کے بدولت جو ذہنی انقلاب اور علمی تغیر حیدرآباد میں ہو گیا ہے اس کے اثرات ایسے نمایاں ہیں کہ یونیورسٹی کے حدود سے باہر بھی بخوبی محسوس ہوتے ہیں۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کا اندازہ حیدرآباد سے باہر رہنے والوں کو صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔

یہاں کا تعلیمی نظام عرصہ تک مدراس یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ رہا اور شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ یہاں کے لوگ اس زمانہ میں اعلیٰ تعلیم میں کوئی نمایاں کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ البتہ اس وقت جن لوگوں کے حالات اجازت دیتے وہ علیگڈھ کالج میں جا کر تعلیم حاصل کرتے تھے، مگر جیسے ہی عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تشنگان علم دوڑ پڑے اور پندرہ سولہ برس کی قلیل مدت میں یونیورسٹی کے فارغین (یہاں کی اصطلاح میں طیلسانین) کی اتنی کافی تعداد ہو گئی ہے کہ حکومت کو اُن کے لیے ملازمتیں فراہم کرنا مشکل ہے اور تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔

حکومت نے یونیورسٹی ہی کے قائم کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ سابقہ غفلتوں کی تلافی کے لیے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی اشاعتِ عام پر بھی نگاہ کی اور محکمہ تعلیمات کی جدید تنظیم کا نتیجہ اس صورت میں نمودار ہوا ہے کہ ملک کے چپہ چپہ پر مدارس قائم ہو گئے ہیں اور ابتدائی تعلیم جبری اگرچہ نہیں مگر مفت ضرور کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے آبادی کے تمام طبقات علی الخصوص غربا کے لیے تعلیم حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔

ریاست کے ذرائع آمدنی اگرچہ برطانوی ہند کے مقابلہ میں کئی وجوہ سے محدود ہیں مگر تعلیم کی مد

میں جس قدر سالانہ مصارف یہاں برداشت کیے جاتے ہیں بلحاظ اوسط شاید ہی ہندوستان کے کسی صوبہ میں اس کی نظیر ملے۔ یہاں کی مجموعی آمدنی آٹھ کروڑ کے قریب ہے اور اس میں سے اسی لاکھ سے اوپر یعنی دس فی صدی سے زائد تعلیم پر صرف ہوتا ہے۔

تعلیم سے بیداری اور بیداری سے ترقی کے لیے بے چینی پیدا ہوتی ہے، اور اس بیداری و بے چینی کے آثار آج یہاں ہر طرف نظر آتے ہیں۔ سابقہ جمود و سکون ابھی کلیۃً مفقود نہیں ہے اور نہ اُس وقت تک ہو سکتا ہے جب تک پرانی نسل کی جگہ نئی نسل کامل جانشین نہ ہو جائے اس کی توقع بھی نہ کرنا چاہیے، تاہم حرکت اور شورش زندگی کی جو رفتار اس وقت دکھائی دیتی ہے وہ ہر حیثیت سے امید پرور ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم کا ذریعہ اُردو ہے اور حیدرآباد کی سرکاری اور دفتری زبان بھی۔ اور اس میں ذرا شبہہ نہیں کہ بمقابلہ سابق کے یہاں اب زیادہ صحت اردو بولی جاتی ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے طیلسانین میں بعض اچھے اہل قلم بھی پیدا ہو گئے ہیں لیکن ابھی اس راہ میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ بول چال کی اصلاح میں تو یہ اہتمام مشکل ہے اس لیے کہ آبادی کا کثیر حصہ جاہل ہے اور ابھی عرصہ تک رہے گا۔ اسکے علاوہ جہاں کثرت سے بولیاں رائج ہوتی ہیں وہاں زبان کی شستگی اور فصاحت کا برقرار رہنا آسان نہیں۔ پرانے محاورات اور قدیم لہجے عرصہ تک باقی رہتے ہیں۔ البتہ تحریری زبان کی درستی میں کامیابی ہو سکتی ہے اور اس بات کی کوشش ہونا چاہیے کہ ملک میں یہ صحت و فصاحت کا جو مشترک معیار قائم ہو گیا ہے اہل حیدرآباد کی تحریریں بھی اُسی معیار کے مطابق ہوں۔

ہمارا خیال تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے یہ معنی ہیں کہ یہاں کے جملہ طیلسانین صحیح اُردو لکھ سکیں گے۔ لیکن جب بعض مطبوعہ تحریریں یہاں اس کے خلاف دیکھنے میں آئیں تو تعجب ہوا اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُردو میں جملہ علوم و فنون ضرور پڑھائے جاتے ہیں مگر سوائے اُن طلبہ کے جن کا مضمون اُردو ہوتا ہے بقیہ کے لیے اُردو زبان و ادب کی تعلیم لازمی نہیں ہے بلکہ اُسکے بجائے انگریزی بطور لازمی مضمون کے پڑھائی جاتی ہے۔

برطانوی ہندوستان میں بھی اب رجحان اسی طرف ہے کہ علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبانوں میں دی جائے۔ اور انگریزی کو بحیثیت زبان کے لازم کیا جائے۔ نیچے کے درجوں میں اب بھی یہی ہو رہا ہے۔ اور غالباً چند سال کے اندر کُل ثانوی تعلیم اسی نہج سے دی جانے لگے گی۔ اور بنگال میں جو کوشش کی جا رہی ہے اُس کو دیکھتے ہوئے تو یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں کلکتہ

یونیورسٹی میں اسی قسم کا انتظام ہو جائے گا جو اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے وجہ امتیاز ہے۔

حیدرآباد کے لیے یقیناً یہ امتیاز کچھ کم نہیں ہے کہ اُس نے ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے میں کل ملک کی رہنمائی کی لیکن اگر عثمانیہ یونیورسٹی اس کا بھی اہتمام کر سکے کہ یونیورسٹی سے جو طیلسانین سند پا کر نکلیں وہ اُس زبان میں جو ذریعہ تعلیم بنائی گئی ہے صحت و روانی کے ساتھ اپنے خیالات قلمبند کر سکیں تو عملی حیثیت سے اُن طیلسانین کے لیے نیز اہل ملک کے واسطے زیادہ مفید ہوگا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے طیلسانین اس وقت بھی حکومت کے مختلف شعبہ جات میں ممتاز عہدوں پر کام کر رہے ہیں اور وہ زمانہ آنے والا ہے جب ریاست کا سارا نظم و نسق انھیں لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور یہ امر مضحکہ انگیز ہوگا اگر سائنس، معاشیات، ریاضی اور فلسفہ کی اعلیٰ اسناد رکھنے کے باوجود وہ سرکاری تحریروں اور عدالتی فیصلوں کی عبارت بھی صحیح نہ لکھ سکیں۔

انگریزی، ہمارے نوجوانوں کے لیے بالکل غیر زبان ہے اور ظاہر ہے کہ بمقابلہ اردو کے اُس کی تحصیل میں کس قدر دشواری ہوتی ہے لیکن برطانوی ہند کی یونیورسٹیوں سے سند فراغ لیکر جو اصحاب مختلف محکموں میں جاتے ہیں وہ اگر سیدھی سادی مگر صحیح انگریزی لکھنا نہ جانیں تو کیسے نکو بنائے جاتے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے طیلسانین بھی جب یونیورسٹی سے باہر نکلیں گے تو اسی معیار پر جانچے جائیں گے۔ ابھی تو وہ حدود ریاست کے اندر بند ہیں اور شاید کچھ روز اور رہیں۔ مگر حالات کی رفتار بتا رہی ہے کہ اُن کو ریاست کے باہر نکلنا ہوگا اور ملک کے مختلف حصوں میں کام کرنا پڑیگا۔ اُس وقت اگر اُن کی تحریریں معمولی سیدھی سادی مگر صحیح اردو میں نہ ہوں گی تو لوگ کس درجہ اُن کی اور خود اُن کی مادر تعلیم کی ہنسی اڑائیں گے۔

شستگی و فصاحت کا اثر ذہنی و دماغی ارتقا پر بھی پڑتا ہے اور ادبی تعلیم کی یہی غایت اصلی ہے۔ اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کی تعلیم مثل لازمی مضمون کے دی جائے یا سند فراغ کیلیے اردو میں صحت کے ساتھ تحریر کی قابلیت شرط قرار دی جائے۔

حیدرآباد سے ایک مذہبی رسالہ ترجمان القرآن نکلتا ہے جسکے ایڈیٹر مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں صاحب موصوف کے بعض قابل قدر مضامین الناظر کے دور اول و ثانی میں نکل چکے ہیں اور عرصے تک بہیتہ علمائے ہند کے اخبار الجمعیۃ کی ادارت بھی وہ کرتے رہے ہیں۔

ترجمان القرآن کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو قرآنی تعلیم کی طرف دعوت دی جائے اور اسلام

کے احکام پر جو شبہات و شکوک بلکہ اعتراضات خود مسلمانوں کا ایک طبقہ کرنے لگا ہے اُن کی تردید متانت و سنجیدگی کے ساتھ عقلی و نقلی دلائل سے کی جائے۔

مولوی ابوالاعلیٰ صاحب جو کام کر رہے ہیں اُن کی تحریروں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے جس قابلیت اور اہلیت کی ضرورت ہے وہ بدرجہ اتم اُن میں پائی جاتی ہے۔ اور اگر ایسے لوگوں کو جن کے دلوں میں واقعی کچھ شکوک ہوں اُن کی تحریریں ملاحظہ کرنے کا موقع ملے تو سو میں ننانوے فی صدی اس کی امید کرنا چاہیے کہ ان کی تشفی ہو جائے گی اور وہ گمراہی سے بچ جائیں گے۔

ترجمان القرآن کے مطالعہ سے دیندار محظوظ ہوں گے، عام طور سے دینی معلومات میں اضافہ ہوگا اور جہاں لامذہبیت اور بے دینی کے جراثیم پرورش پا رہے ہوں انشاء اللہ اس کی مدلل اور دلآویز تحریروں سے اس بیماری کا علاج ہو جائے گا۔ اسی لیے ہماری تمنا ہے کہ ترجمان القرآن کی آواز زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہونچے اور ہم ہر ذی استطاعت مسلمان سے اس کی سفارش کرنا اپنے لیے باعث سعادت و مسرت جانتے ہیں۔

ترجمان القرآن کا چندہ پانچ روپیہ سالانہ۔ حجم ۸۰ صفحے اور کاغذ و طباعت عمدہ۔ ملنے کا پتہ:-
منیجر صاحب رسالہ ترجمان القرآن۔ حیدرآباد دکن۔

مولانا حالی کی صدسالہ برسی کا جشن بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔ اور جو اصحاب اُس میں شرکت کے لیے یہاں سے گئے تھے اُن سے وہاں کے حالات سُن کر مسرت ہوئی۔ نواب صاحب بھوپال نے توقع کے مطابق حالی میموریل فنڈ میں فیاضانہ شرکت فرمائی اور تینتیس ہزار کے قریب سرمایہ فراہم ہوگیا۔ یہ رقم اتنی نہیں کہ بنک میں جمع کر کے محض اُسکے منافع سے یادگاری اداروں کو مدد دی جا سکے اس لیے غالباً آٹھ دس سال سے زیادہ کے لیے کافی نہ ہوگی۔ لیکن اگر ہماری تجویز کے مطابق نصف رقم بھی تصانیف حالی کی اشاعت میں لگادی گئی تو امید ہے کہ اسکی دگنی مدت تک کے لیے کافی ہو جائیگی اور بنک کے منافع سے تو کہیں زائد نفع کی توقع کی جا سکتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر ادیب بے مثال منشی امیر احمد صاحب علوی کی لکھی ہوئی بہادر شاہ ظفر کی سوانحعمری اور اُنکے کلام پر تبصرہ۔ قیمت عہ

نوادر سخن یعنی باب چہارم کتاب نکات سخن۔ جسمیں اردو زبان کے چند نادر الفاظ کی تفصیل و تحقیق بڑی کاوش اور کوشش کے ساتھ مع متعدد مثالوں کے درج کی گئی ہے۔ مصنفہ مولانا حسرت موہانی بی اے ایڈیٹر اُردوئے معلیٰ۔ قیمت ۲ر

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔

عید آ رہی ہے!

لکھنؤ عطر کی بہت بڑی منڈی ہے اور ہم تمام مشہور اور اچھے کارخانوں کا مال روانہ کر سکتے ہیں۔ جس قسم کا عطر درکار ہو ہم سے طلب فرمائیں

قیمت فی تولہ کے حساب سے

عطر بیلہ	[illegible]	[illegible] تک	عطر مجموعہ	[illegible]	[illegible] تک
عطر چنبیلی	[illegible]	[illegible]	عطر بنفشہ	[illegible]	[illegible]
عطر موتیا	[illegible]	[illegible]	عطر عروس	[illegible]	[illegible]
عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]	عطر سہاگ	[illegible]	[illegible]
عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]	عطر دربان	[illegible]	[illegible]
عطر نرگس	[illegible]	[illegible]	عطر مدن مست	[illegible]	[illegible]
عطر مولسری	[illegible]	[illegible]	عطر [illegible] شاہی	[illegible]	[illegible]
عطر موگرا	[illegible]	[illegible]	عطر شہناز	[illegible]	[illegible]
عطر سہاگ	[illegible]	[illegible]	عطر کیسر	[illegible]	[illegible]
عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]	عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]
عطر [illegible]	[illegible]		عطر نارنگی	[illegible]	[illegible]
عطر رات کی رانی	[illegible]	[illegible]	عطر شمامۃ العنبر	[illegible]	[illegible]
عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]	عطر شاہ پسند	[illegible]	
عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]	عطر محبوب پسند	[illegible]	
عطر کیوڑہ	[illegible]	[illegible]	عطر اگر گل	[illegible]	[illegible]
عطر گلاب	[illegible]	[illegible]	عطر اگر گل [illegible]	[illegible]	[illegible]
عطر مشک	[illegible]	[illegible]	عطر دونا	[illegible]	[illegible]
عطر زعفران	[illegible]	[illegible]	عطر کاسنی	[illegible]	[illegible]
عطر عنبر	[illegible]	[illegible]	عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]
عطر عود	[illegible]	[illegible]	عطر گل [illegible]	[illegible]	[illegible]
عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]	عطر کیتکی	[illegible]	[illegible]
عطر خس	[illegible]	[illegible]	عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]
عطر حنا	[illegible]	[illegible]	عطر کیوڑا	[illegible]	[illegible]
عطر اکسیر	[illegible]	[illegible]	عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]
روح گلاب	[illegible]	[illegible]	عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]
عطر اگر عرقی	[illegible]	[illegible]	عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]
عطر [illegible] عنبری	[illegible]	[illegible]	عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]

راحت روح

یہ لاجواب عطر شاہی زمانہ کی ایجاد ہے جو اب صرف یہاں کے ایک قدیم کارخانہ میں تیار ہوتا ہے اور خوش مذاق رئیسوں اور بڑی بڑی سرکاروں میں پسند کیا جاتا ہے۔ قیمت فی تولہ [illegible]

مخلوط آصفی

نواب آصف الدولہ کے عہد میں یہ بے نظیر عطر تیار ہوا تھا اور آصفی کے نام سے موسوم ہے۔ جرمنی اور جاپان کے آئے ہوئے عطر خوشبو کی تیزی و پائداری میں اسکا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ فی تولہ [illegible]

عطر عزیز ناز

یہ عطر یہاں کے ایک مشہور کارخانہ کی سالہا سال کی محنت و کوشش کا ثمرہ ہے اور [illegible] خوشبو والے کئی قسم کے پھولوں کی خوشبو سے تیار ہوا ہے۔ قیمت فی تولہ [illegible]

خوشبودار تمباکو

زردہ

(پتی) فی سیر [illegible]

(مشکی) [illegible]

مشکی دانہ دار [illegible]

مشکی زعفرانی [illegible]

گولیاں

[illegible] فی تولہ [illegible]

نقرئی [illegible]

قوام

قوام مشکی فی تولہ [illegible]

قوام زعفرانی فی تولہ [illegible]

برقی قوام [illegible]

افشانی قوام [illegible]

کشیدی تمباکو

فی سیر [illegible]

پان کا مصالحہ

مشک و زعفران کی آمیزش سے ترکیب پاتا ہے اور پان کو لذیذ و خوش ذائقہ بناتا ہے۔ فی ڈبیہ [illegible]

فی شیشی [illegible]

المشتہر۔ ظفر اللہ [illegible] اینڈ سنس۔ لکھنؤ

منطق و فلسفہ گنگ ہو جاتے ہیں' غالب' بیدل' فیضی' عرفی' نظامی' خسرو' کسی کے یہاں اسکے مقابلے کا شعر نہ نکلے گا کس قدر مضحکہ خیز ہے ۔

صفحہ ۴۶ سطر ۹ ۔

" مگر اس شعر میں مصنف کے زور بیان نے وہ دلآویزی پیدا کردی ہے کہ اگلے اساتذہ کے سیکڑوں اشعار سامنے لائے جائیں تو بھی یہ شعر اپنے منہ سے آپ بولتا نظر آئے گا "

طرز بیان کو جانے دیجیے' سیدھی سادی زبان میں اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اگلے اساتذہ کے بیشتر حصہ کلام پر میرزا یگانہ کے شعر کو فوقیت حاصل ہے ۔ شعر یہ ہے :-

زندہ زیر پیراہن مُردہ در کفن تنہا — طرفہ محشرے دارد از فریب فردائے

میں نہایت ادب سے میرزا یگانہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ فارسی سے قطع نظر کرکے صرف اُردو کو اظہار خیال کا ذریعہ بنائیں تو بہتر ہوگا' وہ لاکھ بلند پروازی کریں' ہزار اُن کا مرغ تخیل سدرہ و طوبیٰ کی خبر لائے' مگر اُنکی فارسی سے نہ صرف "ہندی کھچڑی" کی بو آتی ہے' بلکہ وہ شگفتگی اور معنویت بھی اس میں موجود نہیں ہے جو ہند اور ہندی اساتذہ کے فارسی کلام میں پائی جاتی ہے ۔ یہ تو مسلّم ہے کہ ہندی شعرائے فارسی اور فارسی شعرا کے کلام میں ہمیشہ تمیز کی جا سکتی ہے ۔ اول الذکر کے کلام میں عموماً وہ شیرینی اور بلاغت نہیں ہوتی جو آخر الذکر کے یہاں کم و بیش کلام کا جزو لاینفک ہوتی ہے مگر بعض ہندی شعرائے فارسی نے اپنی قابلیت اور ذہانت سے اپنے فارسی کلام میں بڑی حد تک اُن خصوصیات کو داخل کرلیا ہے جو عموماً اہل فارس کے کلام کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں ۔ ایسے شعرا کی ایک زندہ مثال ڈاکٹر اقبال ہیں ۔ میرزا یگانہ کے فارسی کلام میں جو خشکی اور خشونت ہے وہ ابتدا ہی میں فارسی داں کو اس قدر گراں گزرتی ہے کہ وہ ان کے اشعار کے معانی پر غور کرنے سے پیشتر یہ تصفیہ کرلیتا ہے کہ ان کا فارسی شاعری سے باز رہنا ہی بہتر ہے ۔ مندرجہ بالا شعر ہی میں دیکھیے عبارت کی کرختگی کس قدر نمایاں ہے ۔ میرزا مراد بیگ نے اسی کتاب میں کسی جگہ غالب کے ایک شعر کے متعلق لکھا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے الفاظ جنگل سے لاکر کٹہرے میں بند کر دیے گئے ہیں" اس اعتراض کا جواب میں انشاء اللہ موقعہ پر دوں گا' فی الحال عرض کرنا یہ ہے کہ کیا یگانہ کے مذکورہ بالا شعر میں الفاظ جنگل سے پکڑ لائے ہوئے نہیں معلوم ہوتے ۔ کیا ان میں وہ بے ڈھنگا پن نہیں ہے وہ حیوانیت نہیں ہے جو وحشی درندوں میں پائی جاتی ہے ۔

صفحہ ۶۶ سطر ۹ ۔ " اس تخیل اس بیان کی مثال اُردو کیا فارسی لٹریچر میں بھی نہیں

ل سکتی"

سطر ۱۲ "الفاظ کے انتخاب پر غور کرو تو تاج محل کی صنعت نگاہوں سے گر جائے"

جس شعر کی تعریف کے یہ پل باندھے گئے ہیں ذرا وہ بھی سن لیجیے

جواب کیا وہی آواز باز گشت آئی   قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزا نہ ملا

آپ نے دیکھا میرزا امراد نے اس شعر کی تعریف میں کیا زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں انکے نزدیک اساتذہ کے دواوین عالم تنہائی و بیکسی کے مضامین سے بھرے پڑے ہیں مگر اس شعر کا جواب ان میں نہ ملیگا۔ ان کا مطالعہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس شعر کی ٹکر کا شعر کسی لٹریچر میں نہیں ہے۔ ان کی نظر میں اس شعر میں الفاظ کی نشست ایسی ہے کہ تاج محل کی صنعت نگاہوں سے گر جاتی ہے" اور حقیقت یہ ہے کہ میرزا یگانہ کے وجود سے برسوں پیشتر اردو کے دو غیر فانی سخنوروں نے بیکسی و تنہائی لے اس سے بہتر مضامین اس سے زیادہ موثر پیرایہ میں ادا کیے ہیں

(۱) امیر ایسی کہاں قسمت کہ پونچوں اڑکے پھولوں تک   کبھی جا کے قفس سے جھانک لیتا ہوں گلستاں کو (امیر مینائی)

(۲) ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے   اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے (غالب)

میرزا امراد بیگ کی وسعت مطالعہ کی اصلیت کا جگہ جگہ اندازہ ہوتا جاتا ہے۔

صفحہ ۶۹ سطر ۱۴ ۔ "اسکا جواب میر و غالب تو کیا، عرفی و نظیری کے ہاں بھی ڈھونڈھے سے نہ ملیگا"

معاذ اللہ اس جہل مرکب کی کوئی حد ہے۔ عرفی، نظیری، میر، غالب، سب کے مجموعہ کلام کی کتنی بڑی تنقیص ہے اور بلا دلیل۔ شعر زیر بحث کو بھی ملاحظہ فرمالیجیے:۔

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر   کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ میرزا امراد کی سخن فہمی کی حقیقت ہر ہر قدم پر واضح ہوتی جا رہی ہے۔

صفحہ ۶۷ سطر ۱۲ ۔ "کیا غالب، ٹیگور، براؤننگ اور شیلی کے کلام سے اسکا جواب پیش کیا جا سکتا ہے"

وہ شعر جسکی تعریف میں ان مسلم الثبوت اساتذہ کی اتنی آسانی کے ساتھ تنقیص کی گئی ہے حسب ذیل ہے

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے   وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تعریف و تحسین کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ مخصوص اور مشہور شعرائے دہر کا نام لیکر ان کے کلام پر حرف گیری کی جائے۔

صفحہ ۹۷ -

اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا　　خدا کی شان کہ دشمن نگاہباں نکلا

اس شعر کی تعریف میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مشہور قول " اجلک حافظک " کی ترجمانی پر میرزا امداد بیگ نے یہ کہا کہ " ترجمہ کی اس سے بہتر مثال اردو میں مفقود ہے " معلوم ہوتا ہے انھوں نے نظم طباطبائی مرحوم کی نظم گورِ غریباں اور نادر کاکوروی مرحوم کی نظم " یادِ ایام گزشتہ " کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ اگر انصاف پسند ہیں تو کبھی ایسی بات نہ کہتے - سچ تو یہ ہے کہ اس شعر میں میرزا یگانہ نے جدت تخئیل کی کوئی مثال نہیں دی - اسی مضمون کو فارسی اور اردو کے مختلف اساتذہ متعدد بار اور مختلف پہلوؤں سے بہت پیشتر کر چکے ہیں اور بعض کا انداز بیان میرزا یگانہ سے یقیناً بہتر ہے :-

(۱) بڑے نادان ہیں جو لوگ ڈرتے ہیں امیر اس سے　　اجل تو نام ہے اک زندگانی کے نگہباں کا (امیر مینائی)
(۲) امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک　　نہ اک مو سے بدن کم تھا نہ اک تار کفن کم تھا (آتش لکھنوی)

صفحہ ۱۰۲

جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکا یا　　نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا (یگانہ)

اس شعر کی ستایش میں ارشاد ہوتا ہے " دنیا کے وسیع لٹریچر میں شاید ہی کوئی نمونہ میرزا صاحب کے اس شعر پر فوق لیجا سکے " میرزا امداد نے شاید ٹینی سن Tennyson کی مشہور نظم Crossing the bar اور براؤننگ کی نظم " ربّی بن عذرا " کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ اتنا مہمل دعویٰ زبان سے نہ نکالتے -

صفحہ ۱۲۱ -

خاک کا پتلا بگولا دشت کا ہو جائے گا　　مٹ کے بھی اک پیکر نشو و نما ہو جائے گا (یگانہ)

اسکی تعریف یوں کی جاتی ہے

" میر، سودا، درد، غالب، ذوق، مومن اور جملہ اساتذہ اور شعرا کے دواوین پڑھ جاؤ مگر اس معنی یگانہ کا سہرا مرزا یاس ہی کے سر رہے گا "

تعجب ہے کہ میرزا امداد کو اردو ادب میں اس مضمون کے اشعار نہ ملے - انکے استفادہ کے لیے میں ایک شعر لکھتا ہوں' زیادہ خلش ہو تو نئے سرے اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ کریں - یوں ہی بغیر پڑھے لکھے کوئی لاطائل دعوے زبان سے نہ نکالیں -

(۱) بعد مردن بھی مری گردش قسمت نہ گئی　　خاک ہو کر بھی بگولا ہوں بیابانوں میں

یہ تخییل [illegible] موجودہ شاعر کے متعلق یہ کہنا کہ اس کی ایجاد کا سہرا اس کے سر ہے سراسر جہالت اور ناواقفیت کی دلیل ہے

پہلے اپنی قابلیت آزمانا چاہیے پھر کہیں غالب کے منہ لگے پاس آنا چاہیے

صفحہ ۱۲۳

عشق کا حسنِ طلب اک معنیٔ بے لفظ ہے ٹکٹکی بندھ جائیگی مطلب ادا ہو جائے گا (یگانہ)

اس کی ستایش کا طرز دیکھیے

"اگر اساتذۂ عجم میں سے کسی کے ہاں اس شعر سے لڑتا بھڑتا کوئی شعر نکل آئے تو بڑی بات ہے"

صفحہ ۱۲۶

تماشا ہے مری تصویر کا بیکار رہ جانا قلم کے زخم کھا کر پیکرِ خونبار رہ جانا

"اس رنگینیٔ تخییل کی مثال لکھنؤ کا سارا لٹریچر ایک طرف رکھا جائے تو بھی پیش نہیں کر سکتا"

اس جملے میں جو سقم ہے وہ جانے دیجیے ذرا اس اندھا دھند تعریف کو تو دیکھیے پھر "تماشا یہ ہے" کہ "لکھنؤ کے تمام لٹریچر" میں خواجہ آتش کا کلام بھی شامل ہے جس کے بزعمِ خود میرزا یگانہ اور میرزا مراد دونوں اس قدر قدردان ہیں۔ رہا یہ شعر، مجھے تو اس میں نہ کوئی جدت معلوم ہوتی ہے نہ بلندیٔ تخییل، بلکہ اصل میں اس میں جو خیال پیش کیا گیا ہے وہ اصلیت سے اتنا دور ہے کہ کسی کو بھی پسند نہیں آ سکتا۔ افسوس ہے کہ مجھے اس وقت میرزا صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دینا پڑ رہا ہے مگر وہ خود [illegible] فرما چکے ہیں کہ "اینٹ کی لینی اور پتھر کی دینی کا زمانہ ہے" میری رائے میں تو لکھنؤ کا برے سے برا شعر بھی میرزا یگانہ کے اس شعر سے اچھا ہے۔

صفحہ ۱۵۰

"پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر (یگانہ)

"اردو اور فارسی کا ادب تو کیا دنیا کا کوئی لٹریچر اس شعر کا جواب شاید ہی پیدا کر سکے"

اور لطف یہ ہے کہ اس قدر پامال مضمون اتنی بدمذاقی سے باندھا ہو شاید ہی کسی اور شاعر کے کلام میں ملے۔ [illegible] غالب نے اس مضمون کو تو ایسا نظم کیا ہے کہ یگانہ کے مذکورۂ بالا شعر کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر (غالب)

صفحہ ۱۶۸۔ رہائی کا خیال خام ہے یا کان بجتے ہیں اسیرو بیٹھے کیا ہو گوش بر آواز در ہو کر

"میر تقی میر کا سارا دیوان اُلٹ جاؤ اس درد انگیز صدا کا جواب نہ پاؤ گے"

الامان، میرزا صاحب میر کے دیوان میں تو ہزاروں اس سے زیادہ دلدوز تیر ہیں، لاکھوں اس سے بڑھ کر کلیجہ چھیدنے والے ناوک ہیں۔ میر کے منکسر المزاج معتقدین میر پر جان نثار کرنے والوں کے اشعار میں میرزا یگانہ کے اس شعر سے زیادہ دردے اس شعر سے زیادہ اثر ہے۔ آپ کو متنبہ کرنے کی غرض سے میں صرف دو شعر لکھے دیتا ہوں

(۱) اے جرس تو تو نہیں قافلہ والوں سے جدا تیری آواز میں یہ درد کہاں سے آیا (امیر مینائی)

(۲) اجل اُس گلی سے ہو کر مرے گرد گا رآئے دمِ واپسیں سے شاید مجھے بوئے یار آئے (تسلیم لکھنوی)

صفحہ ۱۷۴

زمیں کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہو کر عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہو کر

"یہ غزل بیسویں صدی کا اسٹرائیں ہے۔ خواجہ وزیر کے مطلع اور اس مطلع میں زمین آسمان کا فرق ہے"

وزیر کا مطلع ہے:

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

بجز اسکے کیا کہا جا سکتا ہے کہ میرزا صاحب کو نہ تغزل سے لگاؤ ہے نہ ذوقِ سلیم سے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی اتنی بدذوقی کے الفاظ نہ لکھتے، وزیر کے مطلع کی شادابی کے سامنے یگانہ کے مطلع کی کرختگی صاف ظاہر ہے

صفحہ ۱۸۹

اُف رے تصرفاتِ عشق آگ لگے دھواں نہو ڈوبے ہوئے ہیں سنگدل لذتِ سوز و ساز میں

"ایسی الہامی زبان پر غالب تو کیا میر کا دسترس مشکل سے ہو سکتا تھا"

واللہ، کیا تعریف ہے اور کتنی صحیح زبان میں، میرزا صاحب کو اس مغالطہ دہی میں شرم بھی نہ آئی، خدا کی شان میرزا مراد بیگ، غالب اور میر کی زبان دانی پر اعتراض کریں، وہ جنھیں خود اُردو کے چند صحیح جملے لکھنا نہیں آتے اساتذہ پر حرف گیری کریں، پھر آخر اس شعر میں خوبی کیا ہے۔ اول تو اس کا مطلب بھی واضح نہیں ہوتا، دوسرے شعر کچھ ایسا گنجلک اور پھیکا سا ہے کہ کسی مذاق کے شخص کو اس میں لطف نہیں مل سکتا۔

اس شعر کی تعریف میں دو اور ارشادات حسب ذیل ہیں:۔

صفحہ ۱۹۱۔ "اے حکیم فرزانہ، تیری فکر رسا عام سطح سے بلند ہو کر اپنے اصلی کاشانے کا سراغ

لگ نے تو تیری قلمرو کا ڈانڈا نبوت کی سرحد سے مل جائے"

صفحہ ۱۹۲ " تو ان سے اعراض کر اور پیغمبرانہ اولوالعزمیوں سے کام لے کر بارگاہ احدیت میں عرض کر"

نعوذ باللہ من ذالک - میرزا صاحب نے یہ کیوں نہ کہدیا کہ "میرزا یگانہ پیغمبر ہیں اور خدا کا قرآنی ارشاد کہ رسول اکرم پیغمبر آخرالزماں تھے غلط ہے" ڈاکٹر بجنوری نے تو دیوان غالب کو الہامی اور آسمانی صحیفے سے نسبت دی تھی، میرزا مرادنے یگانہ کو پیغمبر بنا ہی دیا -

صفحہ ۱۹۵

حسنِ فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں　　معنی بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں

" کیا شیخ سعدی کا شعر بھی فی الحقیقت اسی مرتبہ پر فائز ہے"

لیجیے شیخ علیہ الرحمہ بھی لپیٹ میں آگئے - اُن کا شعر ہے

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

بھلا اس شعر کی رنگینی اور معنویت کی گرد کو بھی یگانہ کا شعر پہنچتا ہے، کیا صرف "معنی بے لفظ" کا ٹکڑا رکھ دینے سے شعر میں تمام حسن پیدا ہوگئے۔ سعدی کے شعر کی سی شیرینی اور بلاغت کیا یگانہ کے خشک شعر میں کہیں بھی ہیں

اس موقعہ پر یہ اعتراض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ یگانہ کے کلام میں چند مخصوص ٹکڑے بہت استعمال ہوتے ہیں جس سے پتہ یہ چلتا ہے کہ انکی قوت ابداع بہت محدود ہے

معنی بے لفظ، صدائے بازگشت، منزل فانوس، بازیچۂ شام و سحر، طلسم بندی، نقش و نگار وغیرہ -

صفحہ ۱۹۷

عمر گھٹنے کے لیے ہے وقت کٹنے کے لیے　　مفت دن گننے کو ہم پکڑے گئے بیگار میں

" میرو غالب تو کیا عرفی و نظیری نے بھی ایسا فلسفہ نہ بیان کیا ہوگا"

مرزا صاحب سچ فرماتے ہیں، غالب اور عرفی وغیرہ اس قسم کا شعر کہنا اپنی ذلت سمجھتے تھے -

صفحہ ۲۵۷

ناخدا کو نہیں اب تک تہِ دریا کی خبر　　ڈوب کے دیکھے تو بیگانۂ ساحل ہوجائے

" مذہب کے فلسفے کو اس قادرالکلامی سے آج تک کسی نے نہیں بیان کیا"

گویا مرزا صاحب نے تمام عالم کے، اگلے پچھلے شاعروں کا کلام، صوفیوں کے اقوال، مبلّغوں کے

خطبے، فلسفیوں کے مقالے، سائنسدانوں کے مکالمے، سیاست دانوں کی تقریریں دیکھی اور پڑھی ہی تو ہیں جو اس بے دردی اور اطمینان سے کہدیتے ہیں کہ "آج تک کسی نے نہیں بیان کیا" اور لطف یہ ہے کہ خود اس شعر کا مطلب نہیں سمجھے ہیں، فرماتے ہیں کہ "ملا جو رسمیاتِ بیہودہ کی اشاعت کرتے ہیں ذرا اڈوب کر تو دیکھیں کہ کتنے پانی میں ہیں" واہ کیا سخن فہمی ہے۔ "وائے بر جانِ سخن" افسوس ہے کہ میرزا صاحب اس صاف شعر کا مطلب سمجھنے سے بھی قاصر رہے۔ فلسفہ شناس صاحب، اس شعر میں نہ مذہب کا فلسفہ ہے نہ مذہب کے پیروؤں کا، یہ شعر تصوف سے متعلق ہے ذرا غور و فکر سے کام لیجیے، مطلب واضح ہو جائے گا۔

(۶)

آیاتِ وجدانی کا دوسرا مقصد جو پہلے مقصد سے کم اہمیت نہیں رکھتا ہے، غالب کی تعریض و تنقیص ہے ___ اندھا دُھند، بے سوچے سمجھے، بے موقع و محل، بار بار ___ ہر چار سطروں کے بعد یگانہ اور غالب کا موازنہ ہے، ہر ہر صفحہ پر یگانہ اور غالب کا تقابل ہے، ہر شعر کی تفسیر کے آخر میں میرزا مراد بیگ شیرازی نے یہی راگ الاپا ہے کہ میرزا یگانہ کو غالب پر فوقیت ہے۔ دیکھنے والا اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ یہ کتاب یگانہ کی تعریف و توصیف میں لکھی گئی ہے یا غالب کی تنقیص میں۔ اس میں یگانہ کی عظمت کے راگ گائے گئے ہیں یا غالب کی نااہلیت کا رونا رویا گیا ہے۔ مگر میرزا صاحب کو اس کا کوئی احساس اور خیال نہیں۔ وہ خوشامد خصلتی کی طوفانی رَو میں اور حسدِ پیشگی کی مجنونانہ دُھن میں ہوش و خرد بالکل کھو بیٹھے۔ ان کو بس ایک سبق یاد ہے کہ غالب و مومن، میر و سودا، عرفی و نظیری، حافظ و سعدی، ٹیگور و ملٹن، غرضکہ عالم سفلی و علوی کے جملہ اہلِ کمال پر یگانہ کو افضلیت و فوقیت ہے۔ وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اس بےڈھنگی جو اس کا دنیا پر کیا اثر پڑے گا، اس مذبوحیت سے لوگ کیا نتیجہ اخذ کریں گے، اس گھبراہٹ کے اظہار سے دنیا کیا سمجھیگی، آیا جو اُن کا مطلب ہے، جس سطحِ نظر کو وہ پیش کرنا چاہتے ہیں، جس چیز کو وہ باور کرانا چاہتے ہیں، وہی ہو رہا ہے یا اسکے بالکل برعکس، اُسکا بالکل اُلٹا، اُس کے بالکل مخالف۔ وہ ہر سطر میں لکھتے ہیں کہ "غالب شاعر نہ تھا"۔ دیکھنے والا سوچتا ہے "وہ شاعر نہ تھا تو یگانہ کا اُس سے مقابلہ چہ معنی دارد"۔ وہ ہر ورق پر دوہراتے ہیں "غالب زباندان نہیں تھا"۔ ناظر خیال کرتا ہے وہ زبان داں نہ تھا تو اسکے مقابلہ میں یگانہ کی زباندانی کا علَم گاڑنے کی کوشش کرنا اس کا مطلب۔ وہ ہر ہر شعر پر چیختے ہیں "غالب نے کبھی اس پایہ کا شعر نہیں کہا" شعر کو جانچنے والا غور کرتا ہے "اس نے کبھی اس پایہ کے

اشعار نہیں کہے تو یگانہ کے اشعار کے ساتھ اس کے اشعار کے ذکر کا کیا مقصد"۔ غالب بُرا تھا، نالائق تھا، جاہل تھا، بے عقل تھا، لاکھ سہی۔ غالب شاعر نہ تھا، جدت طراز نہ تھا، اہل زبان نہ تھا، صاحب ذوق صحیح نہ تھا، ہزار سہی۔ مگر متواتر یگانہ کا اس سے مقابلہ، بار بار یگانہ کا اس سے موازنہ، جگہ جگہ یگانہ کے اشعار کو اس پر ترجیح، قدم قدم پر یگانہ کی تخئیل کو اس کی تخئیل پر فوقیت" اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بیشک ہے اور بلا شبہ ہے، وہ کیا ہے ابھی اس سے بحث نہیں، لیکن میرزا صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارلی، خود اپنی تلوار سے اپنے اوپر وار کیا، اپنی بوکھلاہٹ سے اپنے اغراض کا قلع قمع کردیا، اپنی گھبراہٹ سے اپنے مقاصد پر پانی پھیر لیا۔ چلے تھے غالب کی وقعت کم کرنے، بجائے اسکے اُسکی قدر بڑھادی، روانہ ہوئے تھے یگانہ کا رتبہ بلند کرنے، اسکے بدلے انکی توقیر گھٹادی۔ حقیقت میں میرزا مراد کی بیکسی اور کس مپرسی یہاں پر بڑی مضحکہ خیز ہے ؎

کرنے کیا آئے تھے اور کیا کر چلے۔

لائق، مشہور، اور باعظمت آدمی کو حاسدوں اور دشمنوں کی کمی نہیں ہوتی پہلے اسے اپنے سے نسبتاً کمتر آدمیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا جنکی اُمیدیں جنکی کامیابیاں اسکے سبب سے بارآور نہیں ہو سکتیں جنھیں وہ ہر شعبہ اور ہر مقابلہ میں شکست دیتا ہے۔ بعد ازاں اسے ان غیر معروف اور غیر مشہور، خفیف اور کمظرف، دنیوی جراثیم کے خلاف مدافعت کرنا پڑتی ہے جو دامنِ انسانیت پر داغ ہوتے ہیں، جو ہمہ قسم کی ذہانت و ذکاوت، ہر نوع کی جدت و قابلیت، سے قطعاً معرا ہوتے ہیں، جن کی جانب سے کوئی ایسا فعل عمل میں نہیں آتا جو ملک کو فائدہ پہونچا سکے یا قوم کے لیے مفید ہو سکے، جن میں نہ اتنی سمجھ ہوتی ہے کہ خود کوئی نفع بخش خلائق، سود مند عوام فعل کریں، نہ اس کی استعداد ہوتی ہے کہ اپنے سے برتر دماغ، اپنے سے بہتر ذہانت و قابلیت کے اشخاص کے احکام پر، اپنے سے بلند ذکاوت افراد کے نقوش قدم پر عمل پیرا ہوں۔ اس طبقے کے اصحاب کو اپنی بے بضاعتی کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے اور اس احساس پر وہ نہ صرف دل ہی دل میں جل بھن کر خاک ہو جاتے ہیں بلکہ اپنی سم آلودہ ذہنیت کا زہر اُس پر اُگلتے ہیں جو صحیح معنوں میں قابل اور مشہور ہے، جو حقیقی طور پر باعظمت اور لائق ہے۔ اور ایسا کرنے میں وہ صرف اپنی ذلیل فطرت کے احساسات، اپنی کمینی طبیعت کے الہامات کی تعمیل کرتے ہیں، اپنے کمزور و تمرد کے جذبات کی تکمیل کرتے ہیں۔ دوسرے کی عظمت ان کی ذاتی خودداری

کو صدمہ پہونچاتی ہے اور وہ نہایت آسانی سے حاسد اور غیبت کرنے والے بن جاتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ اگر عوام کی نگاہ میں وہ اپنے محسود کی عظمت، پبلک کی نظر میں اپنے معتوب کی رفعت گھٹا سکے تو وہ اپنے اور اُسکے مابین خلیج کو تنگ تر کر دیں گے۔ یہ لوگ مشاق گو، بے اعتبار افترا پرداز ہوتے ہیں، اور اسی افترا پردازی کو اپنی کامیابی کا واحد آلہ بناتے ہیں۔ وہ اپنی شخصی علمیت، اپنی ذاتی اہمیت، اپنی طبعی جاذبیت کے غلط اور من گڑھت افسانوں کی اشاعت کرتے ہیں اور اس طرح بظاہر خود کو تسلی دے لیتے ہیں، اپنے کو ایک خیالی ارتفاع پر کھڑا کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے محسود کے متعلق نہایت دریدہ دہنی سے، نہایت صفائی سے، دروغگوئی کرتے ہیں، اُسکے کمالات کی تذلیل کرتے ہیں، اُسکے خانگی اور ذاتی حالات کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور اُنھیں دریافت کرکے اُن کی آڑ میں اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں، اور اس طرح بادی النظر میں وہ خود کو تسکین دے لیتے ہیں، اپنی شہرت کو بلند تر تصور کر لیتے ہیں۔

مذکورۂ بالا نشانیوں سے اس قسم کے اشخاص کو ہر انسان پہچان سکتا ہے کیونکہ ہر ناکارہ انسان دو نشانیوں سے پہچانا جاتا ہے، اُس کی نہ چھپنے والی شیخی اور اُس کی لا انتہا ہی غلط بیانی جو در اصل اُسکے اظہار شیخی کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اس کی غلط بیانی چونکہ اُس کی کمزور ذہنیت کا آئینہ ہوتی ہے اس لیے اس سے وہی لوگ دھوکا کھاتے ہیں جو اسکے ہم مذاق اور ہم مشرب ہوتے ہیں۔

کبوتر با کبوتر باز با باز

بعینہٖ یہی حال میرزا یگانہ کا ہے اور ان کی خوشامد میں میرزا مراد بیگ شیرازی کا، ان لوگوں نے دیکھا کہ غالب اپنے انتخاب شاعرانہ خیالات، اپنے نادر تخیلات، اپنے نایاب انداز بیان کی وجہ سے اُردو کے تمام شعرا پر غالب ہے، اس کا فلسفہ، اسکی حقائق آفرینی، اسکی نکتہ سنجی، اسکی وسیع النظری، اس کا طرز ادا، اُردو کے کسی اور شاعر کا چراغ اسکے سامنے جلنے نہیں دیتے۔ اسی کے ساتھ اُنھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان کے پاس وہ شاعرانہ دماغ نہیں جو شاعر کو اصلی معنوں میں شاعر بناتا ہے، وہ وجدانِ سلیم نہیں جو انسان کو حقیقی طور پر رموز فطرت سے واقف کرتا ہے، وہ قوت ابداع نہیں جو انھیں غالب تو درکنار، اور دوسرے اُردو اساتذہ کا مدمقابل بنا سکے، لہذا اُنھوں نے سوچا کہ لاؤ اسکے پیچھے پڑ جاؤ اسکو بُرا بھلا کہنا شروع کر دو، اسکی شاعری کی تنقیص کرو، اسکے اشعار پر نکتہ چینی کرو، تاکہ نہ صرف یہ ہو کہ

بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا

بلکہ ممکن ہے کہ پبلک کے چند ان پڑھ افراد پر جادو چل جائے اور اُن کی نظروں میں یہ غالب سے برتر قرار پا جائیں، خواجہ آتش کو تو محض آڑ بنا رکھا ہے تاکہ لوگوں کو انگشت نمائی کا موقعہ نہ ملے اور دُنیا یہ نہ کہے کہ یہ اشخاص کس قدر متکبر ہیں کہ اپنے منہ میاں مِٹھو بنتے ہیں۔

بہر حال میرزا یگانہ اور میرزا امراد دونوں نے جس خیال کے تحت بھی غالب پر نکتہ چینی کی ابتدا کی ہو یہ ہر شخص کا فرض ہے کہ انکے اس گھروندے کو بگاڑ دے ان کی حیلہ سازیوں اور غلط گوئیوں کا پردہ تار تار کردے۔ میرزا امراد بیگ کی اس آرزو کا کتاب کے حرف حرف سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں غالب کے اچھے اشعار دیکھنے کی حسرت ہے، اُس کی فلسفیانہ شاعری سُننے کا ارمان ہے، اس کی زباندانی کے نمونے دیکھنے کا اشتیاق ہے۔ وہ جگہ جگہ اس کی تمنا کرتے ہیں کہ کاش کوئی میرزا یگانہ کی سی شاعری کے نمونے غالب کے ہاں سے نکال دے، وہ قدم قدم پر اس اشتیاق کا اظہار کرتے ہیں کہ انھیں غالب کے کلام سے بھی ویسے نمونے دیکھنے کا انتظار ہے جو انھیں یگانہ کے کلام میں ملتے ہیں۔ اگر وہ ذرا انصاف پسندی سے کام لیتے تو ان کو غالب کے مختصر سے دیوان سے ان تمام سوالات کا خاطر خواہ جواب مل جاتا مگر انھوں نے اتنی زحمت گوارا نہ فرمائی اور یہ کام دوسروں کے ذمہ ڈال دیا کہ وہ انھیں غالب کے دیوان سے نمونے اور مثالیں چُن چُن کر دکھائیں جس طرح بچوں کا ہاتھ پکڑ کر کارنیوال میں تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ وہ کامل اطمینان رکھیں۔ آیاتِ وجدانی میں جس جگہ بھی اُنھوں نے کسی قسم کی ناواقفیت یا تمنا کا اظہار کیا ہے میں اس عبارت سے مفصل بحث کروں گا۔ گو ان کی یہ آرزو کہ غالب کے اشعار کا میرزا یگانہ کی غزلوں سے مقابلہ کیا جائے اہل دانش و علم کے نزدیک ایک ایسا خبط ہے جس کا جواب خموشی ہی ہونا چاہیے لیکن میں چاہتا ہوں کہ ان کی یہ حسرت بھی نکل جائے ؎

ایں ہم اندر شاعری غمہائے بالائے دگر

مگر قبل اسکے کہ میں اس طرف قدم اُٹھاؤں یہ ضروری ہے کہ ان غلط فہمیوں کا جو انھیں غالب کی طرف سے ہیں یا جن میں وہ لوگوں کو قصداً مبتلا کرنا چاہتے ہیں ازالہ کردوں۔

صفحہ ۱۷ سطر ۱۱

"کیا غالب کو نادان اور بے خبر پبلک کے سامنے اس ناگوار فرض خود ستائی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیا غالب نے اپنے معاصرین پر حملے کرنے اور اُن کی قلعی کھول دینے میں کوئی کسر اُٹھا رکھی"

تھوڑی دیر کے لیے اس بیان کی صحت کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یگانہ غالب کے معاصر کیونکر ہوگئے۔ عصر کے معنی ہیں زمانے کے، اور یگانہ اور غالب کے زمانوں میں جو بُعد ہے وہ ہر شخص پر

ظاہر ہے - ممکن ہے میرزا یگانہ خواب میں شعرائے ماضی کی محفلوں میں شریک ہوئے ہوں جہاں غالب سے نوک جھونک کی نوبت آگئی ہو - مگر میرے خیال میں ایسا ہونا بہت بعید از قیاس ہے - شعرائے گزشتہ یگانہ جیسے مہمل شخص کو کبھی اپنی بزم میں قدم نہ رکھنے دیں گے اور بالفرض یہ کسی طرح پہونچ بھی جائیں تو وہاں سے نکالے جائیں گے

محفل علم سے اس طرح نکلوائے گئے پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

جناب میرزا مراد صاحب - آپ کو یہ کس کتاب میں ملا تھا کہ غالب نے "فرض خودستائی" انجام دیا تھا ' کیا غالب نے آیاتِ وجدانی کی سی کوئی کتاب لکھی تھی یا میرزا یگانہ کی طرح اپنی فضیلت اور بڑائی کا کبھی صور پھونکتے پھرتے تھے ' یا تمام شعرائے عالم سے خود کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی - جو ضروری کتابیں ہیں وہ تو آپ نظرانداز کر جاتے ہیں ' اُن میں رقم شدہ واقعات سے قطع نظر کر لیتے ہیں اور معلوم نہیں یہ "ایجاد بندہ اگرچہ گندہ" والی خبریں کس بھنگڑ خانہ سے سن کر بیان فرماتے ہیں جنکا نہ سر نہ پیر - غالب کے معاصر اصلی معنوں میں صرف دو اشخاص سمجھے جا سکتے ہیں - ذوق ' مومن - کیا غالب نے کبھی ذوق کے خلاف اس دریدہ دہنی ' اس سفید جھوٹ کے ساتھ بغض نکالا ' زیادہ سے زیادہ کہا تو یہ ؎

دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

کیا کبھی اس نے مومن کی مخالفت میں اس طعن و تشنیع کے ہمراہ ' اس تعلّی و شیخی کے ساتھ پروپگنڈا کیا - کیا اسی کو آپ قلعی کھول دینے " کی کوشش سے موسوم کرتے ہیں ' کیا اس نے کبھی معمولی نوک جھونک کے علاوہ جو ہمعصر شعرا میں ہمیشہ عام رہی ہے کچھ اور کیا - جناب میرزا مراد صاحب پہلے غالب کا سا ظرف لائیے تب اس پر اعتراض کرنے کی سعی کیجیے ' پہلے اُس کا سا عالی ہمت اور عالی حوصلہ شخص پیدا کیجیے پھر میرزا یگانہ کو اُس سے نسبت دیجیے ؎ حلوا خوردن را روئے باید - کیا یگانہ نے بھی کبھی اس پر اکتفا کی ؎ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی - یا ؎

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا -

غالب نے کس روز وہ وطیرہ اختیار کیا تھا جو میرزا یگانہ نے اپنا شعار بنا رکھا ہے کہ قدیم اور جدید ' مشرق اور مغرب کے تمام شعرا کو ذلیل کیا جائے ' سب کی ادبی خوبیوں پر حرف لایا جائے ' اور پھر پوچھو تو یہ کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

صفحہ ۲۵ سطر ۱۳ "غالب کا اردو دیوان میرزا صاحب کے مختصر دیوان کے برابر بھی نہیں سکتا"

سطر ۱۶ "غالب کے لیے ایہ ناز فی الحقیقت ان کا فارسی کلام ہے اور خود غالب کا بھی یہی دعویٰ ہے"
جناب میرزا صاحب، غالب کا دیوان کون طلسم ہوش رُبا یا بوستان خیال کی طرح ضخیم ہے جو آپ نہایت تمکنت سے فرماتے ہیں کہ "میرزا یگانہ کا مختصر دیوان" — غالب بیچارے کی تو تمام پونجی ستّو صفحوں سے زیادہ نہیں ہے اور آپ کے میرزا یگانہ کے تو دفاتر اب بھی اشاعت کے لیے باقی ہیں اور جو چھپ چکے ہیں وہی کون کم ہیں۔ "کیا نشتر یاس"، اور آیاتِ وجدانی مجموعۂ دیوان غالب سے مختصر تر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب نے اپنا بہت سا حصۂ کلام اپنی زندگی میں دیوان سے نکال دیا تھا۔ تاہم اگر اسے ملا بھی لیا جائے تو بھی اس کا سب کلام یگانہ کے کلام سے کم ہوگا۔
دوسرا دعویٰ شاید میرزا صاحب غالب کے ان اشعار کے زور پر کرتے ہیں

بو د غالب عندلیبے از گلستان عجم — من بہ غفلت طوطیِ ہندوستاں نامیدمش
فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ — بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

لیکن جناب میرزا صاحب۔ یہ بھی تو غالب ہی کا فرمودہ ہے

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی — گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

صفحہ ۱۷۰ سطر ۸ "
"غالب کی سرقہ یا استفادہ originality جدت طرازی کیا اس حقیقی جدت طرازی کے مقابلے میں ٹھہر سکتی ہے"
پہلے تو میرزا صاحب وہی پرانی ٹھوکر کھاتے ہیں کہ دعویٰ بے دلیل، اس لیے انصافاً تو اسے مہمل سمجھ کر خارج کر دینا چاہیے مگر میرزا صاحب کے مزید اطمینان اور تسکینِ قلب کے لیے میں اس عبارت سے بھی بحث کرتا ہوں۔ جناب میرزا صاحب، شاعری میں آپ سرقہ یا استفادہ کسے کہتے ہیں، اس مسئلے میں صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ پہلی یہ کہ غالب مرحوم نے دوسروں کے اشعار سامنے رکھ کر ان کے مطالب کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنایا۔ گستاخی معاف میں تو غالب کی طرف سے اس کا گمان نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ نہ صرف غالب کی ایمانداری پر حرف گیری کر رہا ہوں بلکہ تمام گزرے ہوئے اساتذہ کو سارق مضامین فرض کیے لیتا ہوں کیونکہ اردو کے کسی شاعر کا کلام فارسی شعراء کے مضامین سے خالی نہیں اور خود فارسی شعراء کے یہاں بھی یہی صورت ہے کہ الٹ پھیر کر مضامین اور تخیلات وہی آتے ہیں انداز بیان جدا ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں ہے تو غالب کے دماغ میں بھی خود بخود، بعینہ وہی تخیل پیدا ہوئی جو شعرائے گزشتہ کے اشعار میں موجود تھی۔ اس صورت میں کسی طرح

بھی غالب کو سارق اور مستعار لینے والا، نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور ایسا ہونا کچھ بعید از قیاس یا ناممکن نہیں۔ دو اشخاص جب اسی درجۂ ذہانت کے ہوتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کے دماغوں میں بالکل وہی خیالات، مطلق غیر ارادی طور پر، قطعاً جدا جدا، آتے ہیں، فرق صرف وقت کا ہوتا ہے اور میں چونکہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ غالب کا درجۂ ذہانت دنیا کے کسی شاعر کے درجۂ ذہانت سے کمتر تھا اس لیے اسے سارق مضامین کہنا کیا معنی رکھتا ہے ؎ من نہ آنم آں کہ ایں افسانہا باور کنم۔

پھر اس کے سوا اُردو، فارسی، انگریزی، لاطینی، عربی، سنسکرت، کس زبان کا کونسا شاعر ایسا ہے جسکے یہاں تمام مضامین محض اُسی کی تصنیف اور تخئیل ہوں، اردو اور فارسی شعرا کی بابت اگر اس کا ثبوت درکار ہو تو اولڈ بوائے، بابت نومبر ۱۹۲۷ء میں قاضی تلمذ حسین صاحب کا مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

کسی فلسفی کا قول ہے "سورج کے زیر سایہ کوئی شے نرالی اور جدید نہیں"

(There is nothing orginal under the sun)

پھر آخر میرزا صاحب جدت طرازی کسے کہتے ہیں، سرقہ اور مستعار خیالات سے ان کا کیا مطلب ہے اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے اُردو کلام میں کہیں بھی ایسے نمونے نہیں ملتے جنھیں اُسکی اور صرف اُسی کی طرف منسوب کیا جا سکے، تو آئیں، محض تفریح طبع کے طور پر، صرف تفنن مزاج کی خاطر، ان چند اشعار کا مطالعہ فرمالیں اور ساتھ ساتھ یہ خیال رکھیں کہ غالب کے یہاں ایسے سیکڑوں اشعار موجود ہیں:—

(۱) پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے ۔ رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
(۲) گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ۔ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
(۳) صفا از حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر ۔ تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
(۴) دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا ۔ یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
(۵) ہبت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی ۔ وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے
(۶) گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے ۔ اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
(۷) توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے ۔ آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

} غالب

اب آئیے اور میرزا یگانہ کے کلام سے چند اشعار کا مطالعہ کیجیے جن کو میرزا مراد صاحب کے معیار کے مطابق سرقہ کہا جا سکتا ہے:—

(بقیہ) یگانہ آرٹ		اشعار غیر
(۱)	آ رہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے ص۲۳۸	خزاں کے دن جب آئے کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں بتا تا تھا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا
(۲)	کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا ص۸۸	بشر کو چاہیے پاس دل بشر رکھے کسیکا ہو کے رہے یا کسی کو کر رکھے "اچھا نہیں ہے کھونا ایام نوجوانی :: اپنا کسیکو کر لو یا ہو رہو کسی کے
(۳)	ہم ایسے بدنصیب کہ اب تک نہ مر گئے آنکھوں کے آگے آگ لگی آشیانے میں ص۲۱۲	وائے ناکامی قسمت کا تماشا دیکھئے میں نے ان آنکھوں سے لٹتے ہوئے گھر دیکھ لیا

صفحہ ۲۶۶ سطر ۹

"غالب نے اتنی عمر پائی مگر ضمیر ملامت شعار کی حقیقت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی"

میرزا صاحب، جب آپ نے غالب کے دیوان کا مطالعہ نہیں کیا ہے تو اس قدر لغو اور فضول دعوے کیوں کرتے ہیں۔ ایک جگہ تو آپ کہتے ہیں کہ "غالب کے یہاں اگر اسکا جواب نکل آئے تو کیا کہنا" دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ "غالب نے ضمیر ملامت شعار پر کوئی روشنی نہیں ڈالی" اس سے آخر کوئی کیا مطلب نکالے، خود ہی آپ اس کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ نے غالب کے دیوان کا مطالعہ نہیں کیا ہے خود ہی پھر اس طرح بیلے زنی کرتے ہیں گویا غالب کا پورا دیوان چاٹ چکے ہیں، اگر خدا توفیق دے تو ذرا غور سے اس بیچارے کے دیوان کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ کتنے رنگا رنگ مضامین سے اسکا دیوان بھرا ہوا ہے۔ فی الحال یہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے تاکہ آپ کو اپنے دعوے کے بطلان کا علم ہو جائے ان اشعار میں گو اس نے ضمیر ملامت شعار سے بحث نہیں کی ہے کیونکہ اتنا مہمل اور دور از قیاس خیال اسکے ذہن میں آتا ہی نہ تھا لیکن میرزا یگانہ نے جس تخئیل کو پیش نظر رکھ کر یہ شعر کہا ہے

سہو و خطا ودیعت فطرت سہی مگر سمجھاؤں کیا ضمیر ملامت شعار کو (یگانہ)

اس سے ملتی جلتی تخئیل کی طرف غالب نے کتنے دلکش پیرایہ میں حسب ذیل اشعار میں اشارہ کیا ہے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے (غالب)

کتاب بھر میں اسی نوع کی غلط فہمی یا غلط بیانی کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ لیکن اب اس کی حاجت نہیں کہ ان سب کا الگ الگ جواب دیا جائے۔ جو جوابات دیے جا چکے ہیں ان کی بنیاد پر امید ہے کہ آیات وجدانی کے ناظرین بقیہ مہملات کو "صدا الصحرا" سے زیادہ وقعت نہ دیں گے۔ اب ضرورت

اس کی ہے کہ جو اعتراضات غالب کی شاعری کے متعلق کیے گئے ہیں اُن کو فرداً فرداً رد کیا جائے اور ناظرین پر ظاہر کر دیا جائے کہ گو بے عیب ذات خدا کی ہے لیکن غالب کے اشعار اور اُنکی قوتِ شاعری کے خلاف جو حملے آیاتِ وجدانی میں کیے گئے ہیں وہ صرف حاسد اور تعصب میں نگاہوں کی کورانہ کوتاہ بینی نکتہ چیں اور جانبدار نگاہوں کی لاینعنی تحقیق ہیں بصارت کے ساتھ بصیرت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ صرف اُردو کے چند الفاظ کے معانی یاد کر لینے سے آدمی نقاد نہیں ہو جاتا چند مخصوص محاوروں اور ترکیبوں کی تک بندی سے انسان شاعر نہیں ہو جاتا۔

ہزار نکتۂ باریک تر زمو ایں جاست نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

صفحہ ۱۴۱ "یہاں جن مضحکہ انگیز جدتوں کا ذکر ہے ان کی مثالیں جس کثرت سے غالب کے یہاں ملیں گی وہ انھیں کا حصہ ہیں۔ غالب کا مشہور مصرعہ ہے دل بدست دپا اُفتادہ برخوردار بستر ہے۔ دل بے دست وپا کے ساتھ افتادہ کا اضافہ اردو میں کتنا مضحک ہے اور دل بدست وپا کو برخوردار بستر کہنا، شہری دماغوں کے لیے کتنی بڑی بوالعجبی ہے"

میرزا مراد بیگ شیرازی اپنے نام کے ساتھ شیرازی کا دم چھلّا لگائے ہوئے ہیں اور پھر بھی اس مصرعہ کی ندرت سمجھنے سے قاصر ہیں نہ صرف یہ بلکہ انھیں اس میں کوئی جدت ہی نہیں معلوم ہوتی اور جو جدت ہے وہ اُنھیں مضحک اور شہری دماغوں کے لیے بوالعجبی کا باعث نظر آتی ہے۔ اُنکا دماغ برخوردار بستر کے معانی سمجھنے کی کوشش میں ٹھوکریں کھاتا ہے، انھیں غالب کی اس جدت طرازی پر ہنسی آتی ہے مگر یہ خیال نہیں آتا کہ ان کے شہری دماغوں پر لوگوں کو زیادہ ہنسی آئیگی، وہ اس کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ غالب کے اس شعر کا پہلا مصرعہ بھی پڑھ لیں جس کا دوسرا مصرعہ وہ پیش کر رہے ہیں اور جس پر وہ اعتراض کر رہے ہیں۔ پہلا مصرعہ یہ ہے "سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے" دادہ کی مناسبت سے دوسرے مصرعہ میں افتادہ، نور العین کی نسبت سے برخوردار کتنی بلاغت کا نمونہ ہیں، پھر سر بصحرا کے ساتھ دادہ کا لفظ لگا کر اور دل بدست وپا کے ساتھ افتادہ کا اضافہ کر کے غالب نے معانی میں جو وسعت اور مطلب میں جو تبدیلی پیدا کی ہے وہ میرزا صاحب کی عقل میں نہیں آتی۔ اس موقعہ پر مجھے ہندوستان کے ایک مشہور شاعر (جو شاعر تو اچھے ہیں لیکن جنکی علمی قابلیت واجبی واجبی ہے) کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ جگر مراد آبادی کی ایک غزل ہے جس کی ردیف ہے "پی گیا"۔ ایک صاحب نے اعتراضاً کہا کہ شروع سے آخر تک غزل بھر میں کہیں بھی اس طرف اشارہ نہیں کہ کیا چیز پی گیا، اعتراض اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل مہمل تھا کیونکہ غزل کا ہر مصرعہ

مرزا رجب علی سرور
- فسانۂ عجائب ۱۲ر
- انشائے سرور ۶ر

امیر مینائی مرحوم
- امیر اللغات (مکمل)
- صنم خانۂ عشق
- مرآۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین ۶ر
- مکاتیب امیر مینائی

جلال لکھنوی
- سرمایۂ زبان اردو
- رسالۂ تذکیر و تانیث ۶ر
- قواعد المنتخب ۴ر

مرزا محمد عباس ہوش
- افسانۂ در جہاں
- پیاری سہیلی ۱۲ر

ریاض مرحوم
- حرم سرا
- ناشاد ۸ر

مرزا رسوا مرحوم
- امراؤ جان ادا
- اختری بیگم ۶ر
- خونی شہزادہ
- شریف زادہ
- ڈراما لیلیٰ مجنوں ۸ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- فسانۂ آزاد کامل
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول
- کامنی ۱۲ر

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین ۴ر
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا ۴ر
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری ۴ر
- طرحدار لونڈی ۸ر
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق
- مرنالنی ۸ر
- مار آستین ۸ر
- بنگالی دلھن ۱۲ر
- پرتاپ ۱۰ر
- روہنی

شوکت تھانوی
- موج تبسم
- بحر تبسم
- سیلاب تبسم
- طوفان تبسم
- برق تبسم
- کہرستان

مولانا عبد الحلیم شرر
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- حسن بن صباح ۶ر
- عصر قدیم ۶ر
- تاریخ یہود
- مسیح اور مسیحیت
- عرب قبل از اسلام
- صقلیہ میں اسلام ۱۲ر
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰ر
- الفانسو ۱۲ر
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- بابک خرمی
- طاہرہ
- مینا بازار
- فردوس بریں ۸ر
- فلورا فلورنڈا
- تاریخی و جغرافی مضامین
- شاعرانہ و عاشقانہ
- مضامین
- گزشتہ لکھنؤ
- سیر رجال
- سیر نسواں
- ادب و تحقیق مسائل
- اصلاح قوم و ملت
- نظم و ڈراما

منشی احمد علی شوق
- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ ۸ر
- عالم خیال
- دیوان شوق

منشی محمد احسن وحشی
- نغمۂ حرم ۱۲ر
- اشک حسرت
- معشوقۂ غریب
- [illegible]

خواجہ عبد الرؤف عشرت
- تذکرۂ آب بقا
- زباندانی ۶ر
- اصلاح زبان اردو ۶ر
- قواعد میر ۶ر
- اصول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری چار کتابیں
- لغات اردو
- سند و شعرا

منشی موہن لال فہم
- چاند سلطانہ
- خاتون اودھ ۱۰ر
- فریب حسن ۱۲ر
- مقدس دیوی ۱۲ر
- مکاری کا پتلا ۱۰ر
- لال چین ۱۰ر

مولانا حکیم عبد الحی مرحوم
- تاریخ گجرات
- تذکرہ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی
- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- " دوم
- " سوم
- " چہارم
- " پنجم
- " ششم
- " ہفتم
- " ہشتم
- " نہم
- " دہم
- " یازدہم
- " دوازدہم
- " سیزدہم
- " چہاردہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی خلیل الرحمن
- اخبار الاندلس
- مختصر تاریخ اسلامی
- مولدین

قاضی ولی محمد سمندری
- سفرنامہ اندلس با تصویر
- سفرنامہ مصر

مولانا اسلم جیراجپوری
- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنی عباس
- عباسیہ مصر
- عباسیہ بغداد
- عمرو بن عاص
- تاریخ نجد

مولوی انشاء اللہ مرحوم
- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات عراق و عرب و عمان
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ
- محاربات پلیونا

مولانا نجم الغنی رامپوری
- بحر الفصاحت
- تاریخ اودھ
- تاریخ راجگان ہند
- تاریخ حیدرآباد دکن
- تعلیم الایمان
- مذاہب الاسلام

حکیم سراج الحق
- سلطان عبد الحمید
- یاد وطن
- فیروز شاہ

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مرزا رجب علی بیگ سرور

فسانۂ عجائب

انشائے سرور

امیر مینائی مرحوم

امیر اللغات (اول)

صنم خانۂ عشق

مراۃ الغیب

محامد خاتم النبیین

مکاتیب امیر مینائی

جلال لکھنوی

سرمایۂ زبان اردو

رسالہ تذکیر و تانیث

قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس حسین ہوش

فسانۂ [illegible] جہاں

[illegible] سہیلی

ریاض مرحوم

[illegible]

مرزا [illegible] مرحوم

[illegible]

حضرت [illegible] احمد [illegible]

فسانۂ آزاد [illegible]

[illegible]

جام سرشار

[illegible]

کامنی

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذین

حاجی بغلول

پیاری دنیا

[illegible] پلیٹ

میٹھی چھری

طرحدار لونڈی

طلسمی فانوس

شیخ [illegible]

مرزا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مولانا [illegible] عبد الحلیم شرر

[illegible]

حسن [illegible]

[illegible]

تاریخ [illegible]

فتح اندلس

[illegible]

حسن کا ڈاکو

[illegible]

منصور موہنا

فلپانا

زوال بغداد

[illegible]

[illegible]

[illegible]

طاہرہ

[illegible]

فردوس بریں

[illegible]

منشی [illegible] شوق

[illegible] شوق

[illegible]

[illegible]

منشی محمد [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خواجہ عبد الرؤف عشرت

تذکرۂ آب بقا

[illegible]

اصلاح زبان اردو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

منشی [illegible]

[illegible]

مولانا [illegible]

تاریخ [illegible]

[illegible]

حکیم [illegible]

تاریخ ابن خلدون [illegible]

دوم

سوم

چہارم

پنجم

ششم

ہفتم

ہشتم

نہم

دہم

یازدہم

دوازدہم

سیزدہم

چہاردہم

سلطان صلاح الدین

[illegible]

مولوی خلیل الرحمن

[illegible]

منشی [illegible]

[illegible]

مولانا [illegible]

سیرۃ الرسول

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تاریخ [illegible]

مولوی [illegible] اللہ [illegible]

سیرۃ الرسول

تاریخ آل عثمان

[illegible]

حالات [illegible]

[illegible]

مولانا [illegible]

بحر الفصاحت

تاریخ [illegible]

[illegible]

حکیم [illegible]

[illegible]

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- سیرۃ المحمود
- وکرم اروسی

مولانا حسرت موہانی بی اے
- شرح دیوان غالب
- مکمل دیوان حسرت
- نکات سخن

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- حکایات و احتساسات
- آسیب الفت
- مظلوب حسینان
- پرانا خواب
- پرانا خواب اور دو افسانے
- ثالث بالخیر
- زہرا
- جلال الدین خوارزم شاہ
- [illegible]

پروفیسر جلیل قدوائی
- اصنام خیالی
- سیر گل
- مو نا دانا
- نقش و نگار

پروفیسر محمد مسلم
- پارسی اسلام اور اسلام
- سلیقۂ تحریر

منشی امتیاز علی مرحوم
- سراج منیر
- ہیملٹ

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن ۲ جلد
- شباب لکھنؤ

منشی امیر احمد علوی بی اے
- تاریخ اودھ
- روزنامچہ حج
- شاہان اودھ
- بہادر شاہ ظفر
- طرۂ امیر
- گوتم بدھ
- یادگار رئیس

مسٹر ظفر عمر بی اے
- مستقبل اسلام
- چوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- لال کنکھجورا

پریم چند
- بازار حسن
- پریم پچیسی
- پریم بتیسی
- پریم چالیسی
- فردوس خیال

مرزا محمد عسکری بی اے
- ادبی خطوط غالب
- تاریخ ادب اردو
- نوادر

پروفیسر منہاج الدین
- ریڈیو
- زینت آسمان
- نظریہ اضافیت

مولوی محمد ظفر ایم اے
- روح القرآن
- روحوں کے کرشمے

مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے
- تاریخ امریکہ
- سیر المصنفین ۲ جلد
- تاریخ مغربی یورپ
- خیالات ارونگ

تیرتھ رام فیروزپوری
- آزادی
- انمول ہیرا
- خونی مکر
- ڈاکٹر نکولا
- سنہری بچھو
- سنہری لاش
- قاتل ہار
- [illegible]
- ناگ کنیا

مولانا سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- خطبات مدراس
- سیرت عائشہ
- حیات امام مالک
- خیام

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوۂ صحابہ ۲ جلد
- سیرت عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
- سیر الانصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات

حاجی معین الدین ندوی
- خلفائے راشدین
- مہاجرین حصہ اول

شاہ معین الدین ندوی
- مہاجرین حصہ دوم
- سیر الصحابہ جلد ششم
- [illegible]
- عرب کی موجودہ حکومتیں

خواجہ حسن نظامی دہلوی
- میلاد نامہ
- ذکر غوث پاک
- کرشن جیون
- سی پارۂ دل
- چٹکیاں اور گدگدیاں
- آسان سبق خطوط نویسی
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- مکتب بیتی کہانیاں
- بچوں کی کہانیاں
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے ۲ جلد

سید ظہور احمد چشتی
- اسلامی زندگی
- تصویر معاشرت
- اسباب عبرت
- زندگی کی صبح و شام
- ہم عمران زندگی
- عروج زندگی
- مالی پریشانیوں کا علاج
- وسائل معاش

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی
- اسلام اور عبادت
- اسلام اور تجارت
- بکھرے ہیرے
- دامن باغباں

مولانا راشد الخیری
- امت کی مائیں
- آمنہ کا لال
- سیدہ کا لال
- صبح زندگی
- شام زندگی ۲ جلد
- نوحۂ زندگی
- در شہوار
- منازل السائرہ ۲ جلد
- سراب مغرب
- بنت الوقت
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- تیغ کمال
- محبوبۂ خداوند
- نالۂ عشق
- وداع ظفر

[illegible]
- صبر کی دیوی
- فسانۂ جوش

نیاز فتحپوری
- جذبات بھاشا
- کیوپڈ اور سائیکی
- شہاب کی سرگزشت
- نگارستان
- جمالستان
- گہوارۂ تمدن

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ